خیالاتِ عالیہ

جلد اوّل

یعنی

مسٹر ایمرسن، بیکن، سر والٹر اسکاٹ، مسٹر ایڈیسن

کے بہترین مضامین کا ترجمہ

مترجمہ

محمد نجم الغنی قریشی

دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن

مطبع اختر دکن حیدرآباد میں چھپکر شایع ہوئی

قیمت فی جلد دو روپیہ

خیالات عالیہ

جلد اوّل

یعنی

مسٹر ایمرسن، بیکن، سر والٹر اسکاٹ، مسٹر ایڈیسن
کے بہترین مضامین کا ترجمہ

مترجمہ

محمد نجم الغنی قریشی
دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن

مطبع اختر دکن حیدرآباد میں چھپکر شائع ہوئی

قیمت فی مجلد دو روپیہ

فہرست مضامین

دیباچہ

از جناب مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی رکن سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

نحمدہ ونستعینہ ونصلی علی رسولہ الکریم

اس دلچسپ مجموعہ میں زیادہ مضامین دو مصنفوں کے ہیں۔ یعنی بیکن اور ایمرسن کے۔ بیکن کے حالات اور خیالات سے ہندوستان کے اردو خواں طبقہ کو ایک حد تک شناسائی ہے۔ اور اس کے اکثر مضامین بعض اردو رسائل اور مجموعوں میں ترجمہ ہو کر شایع ہو چکے ہیں اور ان کے اقوال و اقتباسات انگریزی مدرسوں کی درسی کتابوں میں بھی کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں۔ انگلستان کا یہ بڑا دقیقہ رس فلسفی ہے اور اس کا فلسفہ تمام تر انسان کی عملی زندگی سے تعلق رکھتا ہے اور اس اعتبار سے انگلستان کا کوئی دوسرا فلسفی اس ٹکر کا نہیں گذرا۔ اس کے مضامین پڑھکر ایک اعلیٰ اور کامیاب زندگی

[illegible] تخیل [illegible] شکل [illegible] ہے اور ہم [illegible]
اور یا بھی تعلقات کو بالکل [illegible] ہوئے دیکھتے ہیں۔

[illegible] کے ہاں غضب کی [illegible] بھری ہیں مگر یہ سب [illegible] درحقیقت ہیں۔ حقائق کی تلاش میں وہ چلے تو ان کی توانائی لے کر دوڑتا اور زمین کی تہوں کو کھودتا نظر آتا ہے۔ لیکن زمین سے اوپر اٹھنے کا اس میں حوصلہ نہیں اور سماویات سے ماوریٰ مقام پر اس کا گذر نہیں ہوتا۔ اس کی روح کے پر ٹوٹے ہوئے ہیں۔ عالم روحانیات کی اس نے کبھی سیر نہیں کی نہ اور کسی کو دکھا سکتا ہے۔

اس میدان کا مرد انگریزی مصنفوں میں امریکہ کا باشندہ ایمرسن ہے۔ وہ گذشتہ صدی کا آدمی ہے اور دور ہونے کے باوجود یورپ کی "مشرق شناسی" کی تحریک سے متاثر ہوا۔ الحاد و دہریت کے نقارخانے میں رہ کر بھی اس نے قلب سلیم کی دھڑک سن لی اور کوشش کی کہ روح انسانی کے ان قریب ترین مسائل کو سمجھ لے جن سے دنیائے تمدن کوسوں دور بھاگتی ہے۔ اس کا شمار ان اہل فکر میں ہے جو حقیقی راحت و اطمینان کو انسان

کے باطن میں تلاش فرماتے رہیں۔

اگر کسی غیر مسلم کی نسبت ایسا کہنا جائز ہو تو ایمرسن ایک صوفی فلسفی ہے۔ وہ خدا کی وحدانیت کا، انسان کی جوابدہی اور حشر و نشر کا قائل ہے۔ وہ مراقبے کے فوائد سمجھتا ہے اور احتساب و تزکیہ نفس کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کے عقائد مسیحیت سے دور اور اسلام سے قریب نظر آتے ہیں۔ وہ بعض مسلمان مصنفوں کے اقوال اور کہیں کہیں آیات کریمہ اور احادیث نبویہ (علی صاحبہا من الصلوٰۃ افضلہا) کو عقیدت و احترام کے ساتھ نقل کرتا ہے۔ مشرقی علوم سے اس کی واقفیت بہت ناکافی ہے اور اتباع نبوت سے محرومی نے اس کی خدادانی کو ناقص و سقیم کر دیا ہے لیکن گو وہ روح کی انتہائی بلندیوں کو نہ جانتا ہو اس کی پستیوں سے ضرور آگاہ ہے اور نفس کی اصلاح اور فساد کی علتوں پر اس نے یقیناً بہت غور کیا ہے۔ اس نے اخلاقی تعلیم کی بنیاد مذہب پر رکھی ہے اور اس کے مضامین میں زاہدانہ و حکیمانہ رنگ جھلکتا ہے۔

جب روحانیات کے مسائل عقلیات کے پیرائے میں لکھے

جائیں تو انکے سمجھنے اور سمجھانے میں ضرور دقت پڑیگی۔ ایمرسن کی دشوار نگاری بھی مسلّم ہوگئی ہے۔ کہیں کہیں جملے بے ربط ہیں۔ بعض فقروں کا مطلب مشکل سے سمجھ میں آتا ہے۔ جا بجا معلوم ہوتا ہے کہ خیالات کی کثرت اور وسعت الفاظ کے ظرف میں سمائے نہیں سماتی۔ مگر ان دقتوں کے باوصف ایمرسن انگریزی زبان کے بہترین انشا پردازوں میں شمار ہوتا ہے اور اسکی مصنفات ادبی خوبیوں کے لحاظ سے انگلستان و امریکہ کی تمام جامعات میں داخل درس ہیں لیکن انگریزی سے کسی دوسری زبان خاصکر اردو میں ترجمہ کرنیکے معاملے میں یہ ادبیت ایک اور سنگِ راہ ہے جسکا حسن ترجمے کے آئینے میں دکھا دینا استادانی کی [illegible] چاہتا ہے۔ واقعی ہمارے دوست محمد نجم الغنی صاحب کی حوصلہ مندی قابل رشک اور محنت و عرقریزی لائق آفریں ہے کہ انھوں نے ایسے مشکل نگار ادیبوں کے مضامین کا اردو میں ترجمہ کیا اور بعض ایسے ایسے مطالب کو قابل فہم بنادیا جنکو فلسفہ بلکہ علم تصوف کی واقفیت کے بغیر اصل کتاب ہی میں سمجھنا دشوار تھا۔ خدا کرے انکی کوشش مشکور ہو اور انکا یہ پہلا ادبی کام قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ فقط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعوتِ عمل

ترجمہ از مسٹر ایمرسن

جب ہم غور کرنا شروع کرتے ہیں یا جب ہم اپنی حالت پر عقلی نظر کر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہماری جان حسن و جمال سے ہمکنار ہو رہی ہے۔ جب ہم اپنی زندگی کے گذشتہ واقعات پر غور کرتے ہیں، خواہ وہ واقعات اچھے ہوں یا بُرے تو اُن خیالات سے اس قسم کے خوش کُن تصورات قائم ہو جاتے ہیں، جیسے ہم دور کے بادلوں کو دیکھکر

قایم کرتے رہتے ہیں۔ نہ صرف ایسی چیزیں جن سے ہم مانوس ہوں یا جن کو ہم مکروہ سمجھتے ہوں بلکہ غم فزا واقعات اور خوفناک چیزوں سے بھی ہمیں اس وقت ایک قسم کی خوشی ہوتی ہے جب ہم حافظے کے مرقع میں اُن کے تصورات قائم کرتے ہیں۔ دریا کا کنارہ، پانی کے قریب کی گھاس، وہ گھر جس میں ہم پہلے رہ چکے ہوں، کوئی بیوقوف شخص جس سے ہم مل چکے ہوں۔ گو ان تمام چیزوں سے ہمیں سرسری طور پر ہی سابقہ کیوں نہ پڑا ہو، مگر اُن کے متعلق گذشتہ واقعات پر جب کبھی غور کرتے ہیں تو ہمیں خیالات میں ایک قسم کی خوشی ہوتی ہے۔ یہ ہی چیزیں نہیں بلکہ اگر ہم نے کسی گھر میں کوئی جنازہ بھی دیکھا ہو اور آئندہ کبھی اس گھر کا خیال آجائے تو خیالات اور گھر کی نسبت سے وہ جنازہ گھر کی عمدہ زیبایش معلوم ہوگا۔ رُوح کو بدشکلی، درد، غم اور مصیبت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر ہم اطمینان سے بیٹھکر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور اس وقت سچائی اور خلوص کو قطعی مدنظر رکھیں تو ہمیں اعتراف کرنا پڑے گا کہ ہم نے اپنی زندگی میں کوئی قابلِ ستایش کام اور کوئی قابلِ وقعت قربانی نہیں کی ہے۔ اس اعتراف کے وقت ہمارا ظرف اِتنا وسیع

نظر آتا ہے کہ اگر کوئی شئے ہم سے اس وقت طلب کی جائے تو اس کا دینا ہم پر گراں نہیں گزرتا۔ تمام نقصانات اور تمام تکلیفیں محض وقتی اور عارضی ہوتی ہیں اور ان سے کائنات کو بحیثیت مجموعی کوئی نقصان نہیں پہونچتا۔ مصیبت اور پریشانیاں ہمارے اعتماد کو صدمہ نہیں پہونچا سکتیں۔ ہر شخص اپنی مصیبتوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی تکلیف میں مبتلا ہو اور اپنی مصیبت کا اظہار بھی کر رہا ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ اس میں مبالغہ سے کام لے رہا ہے اس وجہ سے کہ جو تکلیف اسکو پہونچ رہی ہے اس کا تعلق محدود چیز سے ہے غیر محدود چیز کو ان تکالیف سے کوئی صدمہ نہیں پہونچ سکتا۔

اگر آدمی طبیعی زندگی بسر کرے اور اپنے دل میں کسی غم اور مصیبت کا خیال تک نہ آنے دے اس وجہ سے کہ یہ چیزیں صرف اسی کے لئے مخصوص نہیں ہیں تو اس کی عقلی زندگی صحت اور اطمینان سے بسر ہو۔ کسی شخص کو صرف خیالی منصوبوں کی بنا پر پریشان نہ ہونا چاہئے۔ انسان کو اپنی ذاتیات سے تعلق رکھنا چاہئے گو وہ جاہل ہی کیوں نہ ہو اس کی فطرت اس کے خیالات ہیں۔ کوئی

رکاوٹ اور کسی قسم کے شبہات پیدا ہونے نہیں دیگی۔ ہمارے نوجوانوں میں یہ مرض ہے کہ وہ مذہبی مسائل کے متعلق موشگافیاں کیا کرتے ہیں کہ گناہ کی ماہیت کیا ہے، شر کا مبدا کیا ہے، مشیتِ ازلی کسے کہتے ہیں اور اسی قسم کے خیالات میں غرق رہتے ہیں۔ اسی قسم کے خیالات سے ان لوگوں کو کوئی عملی شکل پیش نہیں آتی جو صراطِ مستقیم کو چھوڑ کے اس وادی میں سرگرداں نہیں ہوتے۔ یہ سب روح کی بیماریاں ہیں۔ جن لوگوں نے ان کی تشخیص نہیں کی ہے وہ ان کا علاج بھی نہیں کر سکتے۔ سیدھا سادھا آدمی ان دشمنوں سے آگاہ نہیں ہوتا۔ یہ بالکل دوسری چیز ہے کہ وہ ایک شخص کو اپنی اچھائیاں گنوائے۔ اور دوسرے سے اپنی اتحاد و اتفاق کی کوششوں کی تشریح کرے۔ مگر اس کے لئے وہبی استعداد کی ضرورت ہے۔ تاہم اپنی وجدانی کیفیات کے اتنے صریح علم کے بغیر بھی انسان میں قوتِ ایمانی اور وہ صداقت جس میں یہ قوت مرکوز ہے، ہو سکتی ہے۔ گویا ایک قول کے مطابق "چند بچتہ او صاف طبعی اور چند سادے قواعد" ہمارے لئے بس ہیں۔

میرے دماغ میں وہ انتشار پیدا کرنے والے تصورات جو اب قایم ہوتے ہیں پہلے کبھی قایم نہیں ہوئے تھے۔ سالہا سال کی بالخصوص اعلیٰ درجہ کی تعلیم سے میں وہ نتائج اخذ نہیں کرسکا جو نتائج میں نے ابتدائی تعلیم میں معمولی کتابوں سے اخذ کیے تھے۔ جس تعلیم کو ہم تعلیم تسلیم نہیں کرتے وہ ہی حقیقت میں اس تعلیم سے بہت بیش قیمت ہے جس کو ہم تعلیم مانتے ہیں۔ جب ہمارے دل میں کوئی خیال پیدا ہوتا ہے تو ہم کو اس کی نسبتی وقعت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اور اس صورت میں تعلیم اکثر اپنی جد و جہد کو ان کوششوں میں ضایع کردیتی ہے کہ وہ اس قدرتی قوت اخذ و جاذبہ کو بگاڑ دے اور روک دے جو بلاشبہ اپنے کام کی چیزیں خود فراہم کرسکتی ہے۔

بالکل اسی طرح ہمارا ضمیر ہماری انانیت کی دخل دہی سے خراب ہوجاتا ہے۔ چنانچہ لوگ نیکی کو ایک جد و جہد سمجھتے ہیں اور اس جد و جہد میں جب وہ کامیاب ہوجاتے ہیں تو اس سوال پر ہر جگہ موشگافیاں کرتے رہتے ہیں اور کسی خوش خصلت آدمی کی تعریف کرکے کہتے ہیں کہ جو آدمی بہت سی ترغیبوں کے ساتھ کسی بات کے حاصل

کرنے کی کوشش کرتا ہے تو کیا یہ اس کے لئے قابلِ تعریف بات نہیں ہے؟ مگر یہ کوئی قابلِ تعریف بات نہیں ہے۔ یا تو خدا موجود ہے یا انسان کا بھی وجود نہیں ہے۔ ہم اس نسبت سے ایسی سیرت کو پسند کرتے ہیں کہ اس کے کام ہوش سے ہوں اور خود بخود ہوں۔ ایک شخص جتنا اپنی نیکیوں کا خیال نہیں کرتا اور اپنی اچھائیوں کو کم خیال کرتا ہے اتنی ہی ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔ پلوٹارک نے کہا تھا کہ ٹمولین کی کامیابیاں بہترین کامیابیاں تھیں جو ہومر کی نظموں کی طرح مشہور و مقبول ہوئی تھیں۔ جب ہم ایسے نفس کو دیکھیں جس کے افعال شاہانہ شائستہ اور پھولوں کی سی خوبی رکھتے ہوں تو ہمیں خدا کا شکر کرنا چاہیئے کہ ایسی چیزیں بھی ہو سکتی ہیں اور موجود ہیں۔ یہ نہ کرنا چاہیئے کہ ہم ترش ابرو ہو کر ایک کونے میں کھڑے ہو جائیں اور کہیں اجی میاں لڑ کرمپ کا کیا کہنا وہ ان سے اچھا ہے اور خوب غرّاتا ہے اور بھوت پریت کو بھگا دیتا ہے۔

ہماری عملی زندگی میں طبیعت کو ارادہ اور نیت پر نمایاں غلبہ حاصل ہے۔ تاریخی واقعات میں بھی جتنا کہ ہم کہا کرتے ہیں اس سے ہمارا

ارادہ کم ہوا کرتا ہے۔ ہم قیصر اور نپولین کی طرف دور اندیشیاں اور گہرے منصوبے منسوب کرتے ہیں مگر ان کی زیادہ قوت ان کی فطرت میں تھی ان کی ذات میں نہ تھی۔ وہ لوگ جنھوں نے بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کی ہیں جب وہ اپنے دل میں انصاف کرتے ہیں تو بے اختیار ان کی زبان سے نکل جاتا ہے کہ "ہم انسان ضعیف البنیان ہیں، ہم سے کیا ہو سکتا ہے"۔ اپنے زمانہ کے عقائد کے موافق انھوں نے قربان گاہیں بنائی ہیں، کسی نے قسمت کے لئے، کسی نے مشیت کے لئے اور کسی نے سینٹ جولین کے لئے۔ ان لوگوں کی کامیابی کا راز اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ سلسلۂ خیالات کے ساتھ ساتھ رہے اور ان خیالات نے ان کی ذات میں جاری رہنے کا راستہ بلا روک ٹوک پا لیا اور لوگوں کو یہی معلوم ہوا کہ یہ کام انھوں نے کیا ہے۔ کیا محض لوہے کے تاروں سے بجلی کا انکشاف ہو سکتا تھا؟ یہ بھی سچ ہے کہ وہ صرف ایک ہی خیال پر مسلسل غور و فکر کرتے رہے اور ان کے دماغ میں یہ صفت پائی جاتی تھی جیسی ایک نلی میں خوبی ہوتی ہے، یعنی یہ کہ صرف وہ چکنی اور مجوف ہو۔ وہ جس کو ارادہ اور استقلال کہتے تھے

وہ آمادگی اور ان کا نفس تھا۔ کیا شیکسپیر اپنا نظریہ خود بتا سکتا تھا؟ کیا کوئی ریاضی یا کا ماہر دوسروں کو اپنے فن کی باریکیاں بتا سکتا ہے جن پر اس کی ماہریت اور شہرت کا انحصار ہے؟ اگر بفرضِ محال وہ بتا بھی دے تو اس کی ماہریت اور شہرت فنا ہو جائے گی اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنی امتیازی وقعت بھی کھو بیٹھے گا۔

ان مشاہدات سے ہمیں بہت پُر زور طریقہ پر یہ سبق حاصل ہوتا ہے:۔ کہ ہماری زندگی سہل اور سادہ طریقہ پر بسر ہو سکتی ہے؛ کہ دنیا بہ نسبت اس وقت کے زیادہ دلچسپ ہو جائے؛ کہ کشمکش میں مبتلا رہنے، آہ و فغاں کرنے، نا امید ہونے، کفِ افسوس ملنے اور دانت پیسنے کی ضرورت نہیں ہے اور یہ کہ جو مصیبتیں ہم پر آتی ہیں وہ خود ہماری پیدا کی ہوئی ہوتی ہیں۔ جس وقت ہمیں وہ ہی فضیلت حاصل ہو جاتی ہے جو ہمارے اسلاف کو حاصل تھی یا جب ہم کسی موجودہ اہلِ فضیلت کے ہمسر ہو جاتے ہیں تو ہم فطرت کی ولولہ انگیزی میں خارج ہو جاتے ہیں اور پھر ہم پر یہ بات صاف کھل جاتی ہے کہ ہم ایسے قانون میں گھرے ہوئے ہیں جو اپنا عمل خود کرتے ہیں۔

فطرت کی ظاہری حالت ہم کو یہ ہی سبق دیتی ہے۔ فطرت یہ نہیں چاہتی کہ ہم غم و غصّے میں مبتلا ہوں۔ قدرت کو جس طرح ہماری خیرخواہی اور علم کی پروا نہیں ہے اسی طرح ہمارے فریب اور جنگ و جدل کی بھی پروا نہیں ہے۔ جب ہم کسی انجمن سے یا ساحل سے ٹمپرنس میٹنگ یا ترک مسکرات کی مجلسوں سے نکلتے ہیں یا کسی روحانی کلب سے سبزہ زاروں یا جنگلوں میں جاتے ہیں تو قدرت کہتی ہے "اجی حضرت آپ تو بڑے سرگرم رہیں"

ہمارے بہت سے فعل غیر اختیاری ہوتے ہیں، ہم سے معاملات میں دخل دئیے بغیر نہیں رہا جاتا، ہم چاہتے ہیں کہ ہر کام ہمارے حسب منشا ہو یہاں تک کہ اور لوگوں کی خوبیاں اور ایثار و فیاضی بھی ہمیں بری معلوم ہونے لگتی ہے۔ ہمدردی کا مقتضا تو خوشی ہونا چاہیئے لیکن ہماری ہمدردی اور فیاضی تلخ کامی پیدا کر دیتی ہے۔ ہمارے اتوار کے مدرسے، گرجا اور محتاج خانے محض ایک بار گراں ہیں۔ ہم لوگوں کو خوش کرنے کے لیے سینکڑوں قسم کی مصیبتیں اٹھاتے ہیں مگر کسی کو بھی خوش نہیں کر سکتے۔ ان مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے کے بہت سے

قدرتی طریقے موجود ہیں مگر چونکہ ہم اُن سے منحرف رہتے ہیں اس لئے اپنے مقاصد میں بھی ناکام رہتے ہیں۔ تمام نیکیاں ایک ہی قسم کی کیوں ہوں اور ان کا صلہ ہمیں ایک ہی طریقہ پر کیوں ملے؟ تمام نیکیوں کی جزا ہمیں روپیہ کی صورت میں کیوں ملے؟ یہ ہمارے لئے بہت تکلیف دہ خیال ہے اور ہم اس خیال کی نسبت کچھ نہیں سمجھ سکتے کہ آیا اس سے کوئی مفید نتیجہ بھی نکل سکتا ہے یا نہیں؟۔ ہم غریب ہیں مہاجنوں کے روپیہ ہے۔ وہ اُسے صرف کریں کاشتکار بوتے اور کاٹتے رہیں گے۔ شعرا غزل سرائی کرتے رہیں گے۔ عورتیں سینے پرونے کا کام کرتی رہیں گی۔ مزدور مزدوری کرتے رہیں گے۔ بچے باغوں سے پھول توڑ توڑ کے لاتے رہیں گے۔ مگر تمام سیمت کے اوپر اتوار کے دن کی عبادت کی پابندی کیوں عائد کریں؟ یہ بات بالکل فطرتی اور اچھی ہے کہ بچپن مستفسر ہی ہوتا ہے اور جوانی خود سکھاتی ہے پھر اس کے بعد کا زمانہ وہ تجربے کا زمانہ ہوتا ہے جس میں استفسارات کا کافی جواب لیا جا سکتا ہے۔ اس لئے نوجوانوں کو منبر پر کھڑا کر کے تقریر کے لئے مجبور کرنا اور بچوں کو اس بات پر مجبور کرنا کہ وہ ان سے

سوالات پیچیدہ ہیں۔ یہ دونوں بیکار باتیں ہیں۔

اگر ہماری نظر وسیع ہو تو عالم کی وسعت ہے۔ قوانین کتابیں مذہب اور زندگی بسر کرنے کے طریقے مذاق سے بھری ہوئی حقیقت کی تصویر ہے۔ ہماری سمجھ بہت سی پابندیوں کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ پانی تو بہنے والے پانی کے راستے سے مذہب نے کسی زمانے میں کوئی بند اپنے پہاڑیوں اور گھاٹیوں میں بنایا تھا مگر اب اس کی قدرت نہیں رہی اس وجہ سے کہ اب یہ قانون فرسودہ ہو گیا ہے کہ پانی اپنے خزانہ کی ہموار سطح تک چڑھ آتا ہے۔ ہمارے سامنے ایک ایسی دیوار تھی جس کو چینیوں نے بنایا تھا مگر روس کا ہوائی جہاز اس کو پھاند سکتا ہے۔ یہ کسی ملک کی آمادہ بیکار فوج ہے مگر اس سے صلح بہتر ہے۔ یہ ایک دولت سند فضیلت سے بھری ہوئی ہے مگر بالکل بیکار ہے اسلئے کہ تعصبات انجمنوں سے بھی وہ کام نہیں ہو سکتا ہے۔

اچھا آؤ اب نیچر سے سبق سیکھیں جو ہمیشہ مختصر طریقوں سے کام کرتی ہے۔ جب پھل پک جاتا ہے تو گر پڑتا ہے۔ جب پھل توڑ لیا جاتا

ہے تو پتہ گر پڑتا ہے۔ پانی کا قطرہ گرنے کے لیے ہمیشہ سرنگوں رہتا ہے۔ آدمیوں اور جانوروں کا چلنا آگے کو گرنا ہے۔ ہمارے ہاتھوں کی محنت اور تمام وہ کام جن کا تعلق طاقت سے ہے۔ جیسے لکڑی چیرنا زمین میں گڑھا کھودنا، کشتی چلانا اور اسی قسم کے دوسرے کام۔ یہہ سب کیا ہیں؟ مسلسل گرنا ہے۔ زمین، چاند، سورج اور ستارے ہمیشہ اسی طرح گرتے رہتے ہیں اور اسیطرح گرتے رہینگے۔

کائنات کی سادگی مشین کی سادگی سے بالکل مختلف ہے۔ وہ شخص جو اسی جامع اخلاق طبیعت کو غور بین نگاہوں سے دیکھکر یہ اچھی طرح سمجھ لیتا ہے کہ علم کس طرح سیکھا جاتا ہے اور سیرت کس طریقہ سے پیدا ہوتی ہے، وہ مبصر ہے۔ قدرت کی سادگی ویسی نہیں ہے جسکو آسانی سے سمجھ لیا جائے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ہماری سمجھ کی رسائی اسے باہر ہے اس آخری نکتہ کا حل ناممکن ہے۔ ہم ایک شخص کی امیدوں سے اس کی فراست کا اندازہ کرسکتے ہیں اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قدرت کے غیر متناہی ہونے کا اور اک غیر فانی شباب ہے۔ قدرت کی تازگی سیر سبزی و شادابی کا احساس ہم کو اُس وقت ہوتا ہے جب ہم جیرڈ

کے رکھے ہوئے محدود ناموں کا اپنی خیالی کیفیات سے مقابلہ کرتے ہیں۔ ہم دنیا میں فرقے، مذہب، علم اور پرہیزگاری کے نام سے شہرت پاتے ہیں مگر پھر بھی ہماری وہی حالت ہوتی ہے جو ایک شیرخوار بچے کی ہوتی ہے۔ ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ مذہب کس طرح پیدا ہوا۔ ہر شخص دیکھتا ہے کہ وہ خود ایک اوسط کے نقطہ پرست، جہاں، ساوی، وجود سے ہر چیز کا اقرار یا انکار ہوتا ہے۔ ایک شخص بڈھا ہے، ایک جوان ہے، ایک عقلمند ہے اور ایک شخص جاہل مطلق ہے۔ وہ سنتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ فرشتے کیا ہوتے ہیں اور بساطی کسے کہتے ہیں۔ سوائے فرقہ رواقیین کے اور کوئی مستقل دانشمند نہیں ہے جب ہم کسی بزدل یا چور کے متعلق نکتہ چینی کرتے ہیں تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم ایک اچھے آدمی کی طرفداری کر رہے ہیں۔ لیکن حق بات یہ ہے کہ ہم خود بزدل اور چور رہ چکے ہیں معمولی معمولی واقعات میں ممکن ہے نہ نکلیں، مگر اس حالت میں جب روح کی امکانی انتہائی طاقت کا اپنے افعال سے مقابلہ کیا جائے تو یقینی بزدل اور چور ثابت ہوں گے۔

روزانہ جو واقعات پیش آتے ہیں ان پر اگر ذرا سا بھی غور کیا جائے تو یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ہماری مرضی سے ایک بالاتر قانون پر واقعات کا نظام موقوف ہے۔ کہ ہماری تکلیفیں اور محنتیں فضول اور لاحاصل ہیں، کہ صرف ہم اپنے سہل، سادے اور خود رو فعل میں استوار ہوتے ہیں اور صرف اطاعت اور فرمانبرداری پر قناعت کرنے سے فرشتہ خصلت ہو جاتے ہیں۔ عقیدتمندی اور محبت یعنی عقیدت مندانہ محبت رکھنے سے ہمیں بڑی بڑی پریشانیوں، غم اور مصیبت سے نجات مل جائے گی۔ بھائی جان! خدا موجود ہے۔ وہ کائنات کی ہر شئے پر محیط اور ہر شخص کی مرضی سے بالاتر ہے ہم میں سے کوئی کائنات کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، قدرت کی سحر کاری ہماری فطرت میں اس طرح سمائی ہوئی ہے کہ اگر ہم اس کی ہدایت کو مانیں تو سرسبز ہوں، مگر جب ہم اس سے منحرف ہوتے ہیں تو سخت مصائب میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہی حالت پر خود ماتم کرنے لگتے ہیں۔ کائنات کی ہر چیز سے ہمیں ایمان کا سبق ملتا ہے۔ ہمکو اطاعت کرنا لازم ہے۔ ہم سب کے لئے ہدایت موجود ہے۔ اگر ہم عاجزانہ

سنیں تو بھی باتیں سُنیں گے۔ آخر اس بات کی کونسی ضرورت ہے کہ ہم
محنت شاقہ اٹھا کر اپنے لیے کوئی نمایاں جگہ تلاش کریں، کوئی پیشہ
یا کسی یار دوست کی جستجو میں سرگرداں ہوں، طرز افعال اور سیر و تفریح
کے سامان فراہم کریں۔ یقیناً ہر شخص کو امکانی حق حاصل ہے جس
سے تو ازن اور نہ ماننے انتخابات کی ضرورت نہیں رہتی۔ ہمارے
لیے ایک حقیقت موجود ہے جو سب کا سب تمام ہے اور اسی میں ہر
قسم کے متفرق فرائض بھی موجود ہیں۔ تم زور و دانش کے دھارے
پر بیٹھ جاؤ، جو اس دھارے پر تیرتا ہے اس میں صداقت کی روح
پھونک دی جاتی ہے اور پھر تم بغیر کوشش کے، حق اور کامل تناسب
سے ہمکنار ہو جاؤ گے۔ اس صورت میں تم تمام معترضین کو غلطی میں
ڈالدو گے۔ حق تو یہ ہے کہ تمہیں حقیقت، راستی اور خوبی کی میزان
ہو۔ اگر ہم اپنے کاموں میں اپنی کمبخت دخل وہی سے رکاوٹیں نہ
پیدا کریں، تو تمام کام خواہ وہ سوسائٹی، رسومات یا صنعتوں سے
متعلق ہوں یا سائنس یا مذہبی معاملات سے تعلق رکھتے ہوں بہ نسبت
موجودہ حالت کے بہت اچھے طریقہ پر اس طرح خود بخود ہوتے چلے

جائیں جس طرح قدرتی اسباب سے گلاب کے پھول کھلا کرتے ہیں' ہوا قدرتی اسباب سے پیدا ہوتی اور چلا کرتی ہے' سورج قدرتی اسباب سے خود بخود نکلا کرتا ہے اور غروب ہو جایا کرتا ہے' اور اس طریقے کو خدا نے ازل سے مقرر کیا ہے اور ہر شخص کے دل کی تہ میں بہشت موجود ہے۔

میں کہتا ہوں کہ کسی قسم کا کوئی انتخاب نہ کیا جائے۔ لیکن یہ ایک کلمۂ امر ہے جس کے ذریعے سے میں فرق بتاؤں گا کہ لوگ عام طور پر انتخاب کس چیز کو کہتے ہیں۔ یعنی ہاتھوں[1] کا انتخاب' آنکھوں[2] کا انتخاب' بھوک[3] کا انتخاب۔ مگر یہ تعصبانہ انتخاب ہے۔ انسان کے سارے جسم کا عمل نہیں ہے۔ لیکن وہ شئے جسے میں حق یا سچی کہتا ہوں وہ انتخاب میری پوری ماہیت کا ہے اور وہ چیز جسے میں بہشت کہتا ہوں اور میرا دل اس کی طرف پرواز کرنا چاہتا ہے وہ واقعات کی ایسی حالت ہے جو میری ماہیت کے لئے مطلوب ہو۔

---

[1] ہاتھ نرم چیزوں کو پسند کرتے ہیں اور یہی انکا انتخاب ہے۔ مترجم
[2] آنکھیں سبز چیزوں کو ڈھونڈتی ہیں اور یہی ان کا انتخاب ہے۔ مترجم
[3] بھوک کا انتخاب یہ ہے کہ کھانے کو ملے اور اگر تر مال ہو تو بھلا کیا کہنا ہے۔ مترجم

اور کام جس کی طرف میں عمر بھر سے میلان رکھتا ہوں وہ کام میرے قویٰ کا ہے۔ ہم کو چاہیئے کہ ہر شخص کو اُس کے روزانہ شیوے اور پیشے کے انتخاب کا عقلاً جواب دِہ سمجھیں۔ اس کو کسی قسم کے شیوے اور پیشے کے اِنتخاب کے متعلق جوابدِہ سمجھنا اُس کے کاموں کی معذرت نہیں سمجھی جاسکتی بلکہ یہ اس کے پیشے کی رسوم ہیں۔ اِسے ایسے خراب پیشے کے اِنتخاب سے کیا کام ہے؟ کیا اپنی سیرت کو درست کرنا خود ایک پیشہ نہیں ہے؟۔

ہر شخص کا ایک خاص شغل ہوتا ہے۔ ذہانت اس کا شیوہ ہے۔ اس کے لئے ایک راستہ کھلا ہوا ہے جس پر گام زن ہو کر وہ اعلیٰ سے اعلیٰ پیشے اختیار کر سکتا ہے۔ اس راستہ پر قابلِ اِنتخاب بہت سے ایسے شعبے ہیں جو اس سے ہم آغوش ہونے کیلئے نامعلوم طریقہ سے اس کو بلاتے رہتے ہیں اور ان سے ہمکنار ہو کر انسان کامیابی کے لئے ایسی جد و جہد کر سکتا ہے جو کبھی ختم نہ ہو۔ انسان دریا کے ایک جہاز کی شکل ہے جس سمت وہ جا رہا ہے اس راستہ پر کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہے بلکہ اور اطراف سے وہ خوفناک چٹانوں اور

بہت سے خطرناک پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے اور اس راستہ سے وہ ایک خوشگوار نہر میں سے ہوتا ہوا صد ہا نشیب کے بحرِ بے کنار میں جا رہا ہے۔ اس قسم کا اس کا ادراک اور تجربہ اس کی تربیت پر منحصر ہے یا اس طریقہ پر جس میں اس کی روح نے جنم لیا ہے۔ اس کا میلان ایسے کام کی طرف ہوتا ہے جو اس کے لئے آسان ہو اور جب کرتا ہے تو اچھا کرتا ہے بلکہ اس خوش اسلوبی سے کرتا ہے کہ کوئی دوسرا آدمی نہیں کر سکتا۔ اس کام میں اس کا کوئی رقیب نہیں ہوتا۔ انسان کسی کام کو جتنا اپنی روحانی قوتوں کے مشورے اور ایما سے کرتا ہے اتنا ہی اس کام میں جس کو وہ کر رہا ہے دوسروں کے کاموں سے فرق معلوم ہوتا ہے۔ اس کی امنگیں اس کی روحانی قوتوں کے صحیح تناسب سے ہوتی ہیں۔ کسی مینار کی بلندی اس کے قاعدے کی چوڑائی سے معلوم ہو جاتی ہے۔ ہر شخص میں اس کی قوت کا مقتضا یہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی انوکھا کام کرے اور جو بات اس میں ہوتی ہے دوسرے آدمی میں نہیں پائی جاتی۔ یہ ادعا کہ انسان ایک اور کام بھی خوب کر سکتا ہے وہ یہ کہ اسے شہرت حاصل ہو، لوگوں

میں امتیازی وقعت نصیب ہو اور ان واقعات کی بناء پر جو اس سے غیر متعلق ہوں یہ سمجھنے لگے کہ "لوگ اُسے عجیب و غریب آدمی تصوّر کریں اور عام لوگوں میں اس کا شمار نہ ہو" یہ دیوانگی نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ اور اس بات کے سمجھنے میں بھی وہ کودن ہے کہ ہر شخص کو ایک ہی طرح کا ذہن عطا ہوا ہے اور اس عطیہ میں کسی کی ذاتیات کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے۔

اِنسان جب کوئی کام کرتا ہے تو اس کام میں وہ لوگوں کو اس ضرورت کو محسوس کراتا ہے جس کو وہ پورا کرسکتا ہے اور پھر اس مذاق کو پیدا کرتا ہے جس کی وجہ سے لوگ اُسکے کارناموں سے مسرّت حاصل کرسکیں۔ اپنا مخصوص کام کرنے سے اس کی ہستی لوگوں پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ آج کل کی ہماری عمومی تقریروں میں یہ بڑا نقص ہے کہ ان میں بے ساختگی نہیں ہوتی۔ نہ صرف ہر مقرر، بلکہ ہر آدمی کو چاہیئے کہ جب اور جہاں کہیں وہ تقریر کرے تو جو کچھ اچھے یا بُرے خیالات اس کے دل میں ہوں یا ہو سکتے ہوں انکو نہایت راست بازی سے بلاتکلف ظاہر کردے۔ مگر عام طور سے یہ تجربہ ہوا ہے کہ انسان

اپنے کام یا پیشے کی جو اس نے اختیار کر لیا ہے معمولی ضروریات کے انجام دینے کی بُری بھلی جیسی اس سے ہو سکتی ہے قابلیت پیدا کرتا ہے اور اس کو بلا کسی ذاتی شوق کے اس طرح کئے جاتا ہے جس طرح سکھایا ہوا طوطا بیٹھی بھر آتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر وہ اس کام میں دلچسپی لیتا ہے تو پھر اس کو اس انہماک سے کرتا ہے کہ اسی میں فنا ہو جاتا ہے۔ جبتک کوئی انسان یہ بندوبست کرے کہ اپنے آپ کو لوگوں پر ظاہر کرے جس میں اُس کا پورا قد و قامت اور ڈیل ڈول ظاہر ہو جائے مگر افسوس ہے کہ اس وقت تک اس کو اپنے خاص مشغلے کا علم ہی نہیں ہوتا۔ اس کو چاہیئے کہ اپنی سیرت میں کوئی ایسی خاص بات پیدا کرے تاکہ اس کا کام لوگونکی نگاہوں میں جنچے۔ اگر وہ کوئی ذلیل کام کر رہا ہے تو اس کا رویہ اس کام کو قابل تقلید بنا سکتا ہے۔ جن باتوں کا اسے علم ہو جیسے اسکے خیالات ہوں یا جو کام اس کے خیال میں کرنے کے قابل ہو۔ بہتر ہے کہ ان باتوں کو وہ لوگوں پر ظاہر کر دے ورنہ لوگوں کو اس کا صحیح علم نہ ہوسکیگا اور نہ کبھی لوگ اس کی عزت کرینگے۔ یہ بڑی حماقت ہے کہ تم اس

کام کی جس کو تم کر رہے ہو ذلیل اور ظاہری صورت پر نظر کرو بلکہ تمھیں یہ چاہیئے کہ تم اسی کام کو اپنی سیرت اور مقاصد کا مظہر بناؤ۔

ہم صرف ایسے کاموں کو پسند کرتے ہیں جن کی لوگ پہلے سے تعریف کرتے چلے آرہے ہوں اور اس بات کو نہیں دیکھتے کہ جس کام کو انسان کر سکتا ہے آیا وہ منجانب اللہ بھی ہو سکتا ہے یا نہیں؟ ہم اس بات کا تو خیال کرتے ہیں کہ بعض مقامات یا فرائض میں بعض خدمتوں یا موقعوں میں بڑائی ان کے نام کے ساتھ لگی ہوتی ہے مگر اس بات پر غور نہیں کرتے کہ ایک شخص تانت کے باجے سے، دوسرا شخص یہودیوں کے بربط سے، ایک پھرتیلی انگلیاں رکھنے والا بچہ قینچی سے کاغذ کے پرزے کر کے، چرواہا سور کے گلہ سے اور ایک سپاہی ذلیل مقام اور ذلیل طبقے کے لوگوں سے وجدانی کیفیت اخذ کر سکتا ہے۔ جس حالت کو ہم تاریک حالت یا عامیانہ سوسائٹی کہتے ہیں وہ ایسی حالت اور ایسی سوسائٹی ہے جس کی طرف ہم نے ابھی تک کوئی توجہ نہیں کی ہے۔ لیکن تم اسی حالت اور اسی سوسائٹی کو ابھی ایسا بنا دو گے جس پر لوگ رشک

کریں اور جو شہرت چاہتے ہیں اپنا آپ چھپاتا ہو۔ اچھا آؤ اب اسکے لئے
اپنے اندازہ کے مطابق بادشاہوں کی حالت پر غور کرکے نتیجہ اخذ
کریں۔ مہمان نوازی کے شعبوں کے متعلق خاندانی تعلقات کی بابت
میں جو ملک کے عہدوں کی نسبت اور اسی قسم کی ہزاروں چیزوں
کے لئے جو ہمارا نقطۂ خیال ہے بادشاہ اپنے نقطۂ خیال
سے اندازہ کرتی ہے اور حقیقتاً بادشاہوں کو ایسا ہی کرنا چاہیئے۔
کسی چیز کے متعلق اپنے خیالات میں ایک نیا اندازہ کرتے رہنا
خیالات کی بلندی کہلاتا ہے۔

آدمی کا جس کام پر بس ہوتا ہے اسی کو وہ کرتا بھی ہے اس
کام میں اس کو امید یا بیم سے کیا سروکار۔ انسان کی ذات بجائے
خود ایک قوت ہے۔ اگر انسان سوائے اس نیکی کے جو اس کی
فطرت میں موجود ہے اور کسی نیکی کو مستقل نہیں مانتا تو نہ مانے دو
اور یہ نیکی اس کے اندر اس کی زندگی کے ساتھ ساتھ نشوونما پاتی
رہیگی۔ قسمت کی خوبیاں خزاں کے پتوں کی طرح آتی جاتی رہتی
ہیں۔ انسان کو چاہیئے کہ ان کو ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ منتشر

ہو جانے دے اس وجہ سے کہ جو انکشافات کی پیداوار کی غرض کی فوری علامات ہیں۔

اس کی ذاتی خیالات بھی ہوتے ہیں۔ ایک شخص کی ذات سے اس کی امر قابلیت سے جس سے وہ لوگوں میں اپنی ذات پیدا کرتا ہے اس کے اس انتخاب سے جو اس کے لئے موزوں ہے اس کے اس چیز کی رو سے جو اس کے لئے موزوں نہیں۔ ان سب باتوں سے انسان کو کائنات کی نوعیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ انسان ایک مجسم اسلوب ہے، ایک ترقی پذیر انتظام ہے، ایک اِنتخاب کرنے والا اصول ہے۔ غرض وہ جس قسم کا ہوتا ہے اپنی سمجھ اور فراست کی مدد سے اپنے ہی جیسے لوگوں کا ہر جگہ اِنتخاب بھی کر لیتا ہے۔ وہ ان لوگوں کی کثرت میں سے جو اسکے اردگرد ہوتی ہے یا اس کو گھیرے ہوئے رہتی ہے صرف اپنے ہی مذاق کے آدمی ڈھونڈ لیتا ہے۔ وہ ان جالیوں کی مانند ہوتا ہے جو سمندر کے کناروں پر سے دریا پر لگائی جاتی ہیں تاکہ وہ لکڑیاں جو بہتی ہوئی آیا کرتی ہیں رُک جایا کریں، یا اسکی مثال ایسی ہے جیسے مقناطیس کی لوہے کے ریزوں میں ہوتی ہے۔ وہ

واقعات، الفاظ اور اشخاص جو انسان کے حافظہ میں محفوظ رہتے ہیں
اور جن کے متعلق انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کا
سبب یہ ہے کہ یہ باتیں انسان سے بہت کچھ اہم تعلق رکھتی ہیں، وہ یہ کہ
اس نے ابتک ان باتوں پر اچھی طرح غور نہیں کیا ہے۔ یہ باتیں اس
کے لئے بڑی قابل قدر ہیں اس وجہ سے کہ وہ انھیں باتوں کے ذریعہ
سے اپنے شعور (ادراک) کی ترجمانی کرسکتا ہے اور اس کی تشریح
کے لئے اس کو زٹل قافیوں کی کتابوں اور تنگ دماغوں میں الفاظ
نہ مل سکیں گے۔ جو چیز مجھے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے میں لامحالہ اسی
سے مشغول ہونگا۔ کیونکہ جو شخص میرے دروازے کو کھٹکھٹا رہا ہے میں
اسی کے پاس جاؤں گا ورنہ ہزاروں ایسے ہی لوگ میرے دروازے
کے سامنے سے نکل جاتے ہیں اور میں ان کا خیال بھی نہیں کرتا۔ مثال
کے لئے کافی ہے کہ یہ خصوصیات گویا مجھ سے مخاطب ہیں۔ چند لطیفے،
چند سیرت کے امتیازات، چند روئے، چند صورتیں، چند سانحے۔
یہ سب باتیں تمہارے حافظے میں جمی ہوئی ہیں اور اپنی ظاہری حالت
کی نسبت سے اور جملہ امور سے بہت بڑھی ہوئی ہیں۔ اگر تم ان باتوں کی

جانچ معمولی معیار سے بھی کرنا چاہو گے تو زیادہ اہم نہ معلوم ہوگی۔ ان سب باتوں کا تعلق تمہاری خداداد استعداد سے ہے۔ اِن باتوں کا وقار اگر تمہارے ذہن میں قایم ہوگیا ہے تو ہو جانے دو اگر اس قسم کی مثالیں تمھیں علمی کتب میں نہ مل سکیں تو نہ سہی مگر اس وقار کو جو تمہارے ذہن میں قایم ہوگیا ہے بیکار نہ جانے دو' اس وجہ سے کہ جس کو تمہارا دل بڑا سمجھتا ہے وہ حقیقت میں بڑا ہے۔ رُوح جس بات کی صحت پر اصرار کرے وہ ہمیشہ صحیح ہوتی ہے۔

جن چیزوں کو انسان کی فطرت اور فہانت پسند کرے بہ نسبت اور تمام چیزوں کے انسان کا ان پر سب سے زیادہ حق ہے انسان کی روحانی قوتوں سے جو چیزیں تعلق رکھتی ہیں ان کو وہ ہر جگہ لے سکتا ہے' نہ کوئی انسانی قوت ان کے لینے سے روک سکتی ہے اور جو چیزیں اس سے غیر متعلق ہیں اُن میں سے ایک چیز سے بھی وہ مستفید نہیں ہو سکتا' گو کسی قسم کی کوئی رکاوٹ بھی نہ ہو۔ جس راز کے جاننے کا جو شخص مستحق ہے اُس سے اِس راز کو پوشیدہ رکھنا ایک لاحاصل کوشش ہے۔ اِس وجہ سے کہ وہ راز اُس پر

خود بخود ظاہر ہو جائے گا۔ وہ طرزِ عمل جس سے ایک دوست ہمیں اپنا مطیع کر سکتا ہے، اور جب ہم اس طرزِ عمل کی بنا پر اس کے مطیع ہو گئے تو پھر اس کو ہمارے خیالات پر حق ہو جاتا ہے اور وہ ان خیالات کو جاننے کے لئے ہمیں مجبور کر سکتا ہے۔ یہ ایسا قانون ہے جس کو مدبر لوگ عمل میں لاتے رہتے ہیں۔ جمہوریت فرانس کے وہ تمام خطرات جن سے سلطنت آسٹریا مرعوب ضرور ہو گئی تھی، مگر ان خطرات سے اس کے ممالک غیر کے تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑا لیکن نپولین نے پرانے طبقہ امراء کے ایک امیر کو جس کا نام ایم ناربن تھا وائنا کو بھیجا۔ اس شخص کو وہ اصول، طریقے اور اغراض بتا دئیے گئے تھے جن کے لئے وہ بھیجا جانے والا تھا اور اس کو بھیجتے وقت نپولین نے یہ کہا تھا کہ یورپ کے پرانے طبقہ امراء کے لئے ایک ایسے ہی طبقے کے آدمی کا بھیجا جانا ناگزیر ہے جو ان سے اس قسم کا تعلق رکھتا ہو اور اس کے علاوہ ان میں خفیہ برادرانہ تعلقات بھی ہوں مسٹر ناربن نے دو ہفتے سے بھی کم کی مدت میں شہنشاہی کابینہ کے تمام رموز سے واقفیت حاصل کر لی۔

کسی بات کا کہنا اور اُس کا سمجھا دینا' بظاہر اس بات سے زیادہ کوئی بات آسان نہیں معلوم ہوتی۔ ابھی کے ساتھ آدمی کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کا مطلب سمجھ لیا جانا ہی اس کا سب سے بڑا بچاؤ در حقیقت اندازہ ہے اور ایسے مفہوم پر جب کوئی رائے زنی کیجائے تو اس وقت یہی شئے قائل کے لئے بہت پریشان کن ہوگی (کیونکہ اُسی گنجایش یہ کہنے کی نہیں رہے گی کہ یہ میرا مطلب نتھا)۔

اگر کوئی استاد کسی بات کو پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے تو اس کے شاگرد ان باتوں سے جن کا اس نے اظہار کیا ہے اس کی اس بات کو اچھی طرح جان لیں گے جس کو اس نے چھپانے کا ارادہ کیا تھا۔ اگر تم کسی حلقہ دار برتن میں' جس میں کجی یا خول ہوں' پانی ڈالو' تو پانی کی سطح خود بخود برابر ہو جائے گی۔ اس کے لئے یہ کہنا بیکار ہے کہ اگر میں اس میں اس طرح پانی ڈالوں گا یا اس طرح پانی ڈالوں گا تو پانی کی سطح ہموار نہ ہوگی۔ آدمی تمہارے اصولوں کے نتائج کو محسوس کرتے ہیں اور اسی کے مطابق کام بھی کرتے ہیں اگرچہ وہ اس بات کو ثابت نہیں کر سکتے کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ ہمیں کسی قوسی شکل کا کوئی حصہ دکھاؤ

ہم نہیں بتا سکتے مگر ایک اچھا ریاضی داں پوری شکل بتا دے گا۔ ہم ہمیشہ شاہد سے غائب پر حجت قایم کیا کرتے ہیں۔ لہذا اگلے زمانہ کی دانشمندیاں ہم پر اسی طرح ظاہر ہوئی ہیں۔ ایک شخص اپنی کتاب میں ایسی گہری باتیں نہیں لکھ سکتا جس کو لوگ سمجھ نہ سکیں۔ اگر وہ ایسا کرے بھی تو وقت کے لحاظ سے ایسے قابل آدمی پیدا ہو جائیں گے۔ جو اس کی باتوں کو سمجھ لیں گے۔ کیا افلاطون کا ایک پوشیدہ مسئلہ تھا؟ ہاں تھا! مگر وہ بیکن، مانٹیگو اور کینٹ جیسے قابل لوگوں سے نہ چھپ سکا۔ اسی وجہ سے ارسطا طالیس نے اپنی تصانیف کے متعلق کہا تھا کہ "وہ شایع بھی ہوئی ہیں اور نہیں شایع ہوئی ہیں"۔

جس شخص نے کسی بات کے سیکھنے کے لئے جب کوئی تیاری نہیں کی ہے تو وہ اس صورت میں اس کو سیکھ بھی نہیں سکتا اگرچہ کہ وہ بات اس کی آنکھوں ہی کے سامنے کیوں نہ ہو۔ اگر کیمیاگر اپنے علم کے عمدہ مسئلوں کو ایک بڑھئی پر بھی ظاہر کر دے تو وہ اُن کو کیا سمجھے گا۔ مگر وہ راز کسی اور کیمیاگر کو وہ ایک زرِ خطیر کے بدلے بھی نہ بتلائے گا۔ خدا ہم کو قبل از وقت خیالات سے محفوظ رکھتا ہے۔ جو چیزیں ہماری

آنکھوں کے سامنے صاف طور پر موجود ہیں ان کو بھی ہم اُس وقت تک دیکھ اور سمجھ نہیں سکتے جب تک ذہن ان کے سمجھنے کے لئے پختہ نہ ہو جائے۔ پھر اس حالت میں جب ہم ان کو دیکھتے ہیں تو وہ وقت ہمیں خواب نہیں معلوم ہوتا۔

تمام خوبیاں اور عجیب و غریب باتیں جو دنیا میں ہیں، انسان ہی کی ہستی میں موجود ہیں نیچر میں نہیں ہیں۔ دنیا بالکل خالی خولی ہے اور اس کا تمام فخر و ناز صرف انسانوں ہی کی رونق اور چہل پہل پر منحصر ہے۔ دنیا جس شان و شوکت سے لبریز ہے وہ اس کی ذاتی نہیں ہے۔ ٹیمپی، ٹوولی اور روم کی وادیوں میں اب مٹی، پانی، چٹانوں اور بادلوں کے سوا کیا رکھا ہے۔ چنانچہ ایسی ہی مٹی اور پانی ہزاروں جگہ ہیں لیکن ان کا کچھ اثر نہیں ہے۔

لوگ سورج، چاند، افق اور درختوں کی وجہ سے عقلمند نہیں ہو جاتے ہیں کیونکہ اب تک یہ دیکھنے میں نہیں آیا ہے کہ روم کے تصویر خانوں کے محافظ یا مصوروں کے خدمتگار کسی قسم کے خیالات کی بلندی دوسرے لوگوں کی بہ نسبت زیادہ رکھتے ہوں یا یہ کہ

کتب خانوں کے مہتمم بہ نسبت دوسرے لوگوں کے زیادہ عقلمند ہوں۔ شائستہ اور شریف آدمی کی وضع میں خوبیاں ہوتی ہیں۔ ان خوبیوں کو بیہودہ شخص نہیں دیکھ سکتا۔ یہ لوگ ایسے ستاروں کی مانند ہوتے ہیں جن کی روشنی ہم تک نہیں پہونچی ہے۔

انسان کے جس قسم کے خیالات ہوتے ہیں اسی قسم کی باتوں سے اسے سابقہ بھی پڑتا ہے۔ ہمارے خواب ہماری حالت بیداری کے علم کا ضمنی نتیجہ ہیں۔ ہماری رات کے خواب دن کے خیالات سے ایک قسم کی نسبت رکھتے ہیں۔ عجیب خواب گویا دن کے گناہ ہیں جو زیادہ پھیل کر سامنے آتے ہیں۔ خراب خیالوں میں ہم کو ہماری ہی خراب خواہشوں کی تصویر نظر آتی ہے۔ کوہ البا پر ایک مسافر کو اپنا سایہ ایک دیو کی مانند معلوم ہوتا ہے اور ہاتھ کی جنبش سے وحشت ہوتی ہے۔ ایک تاریک گھر میں جاتے ہوئے بچے جب کسی چیز سے خوف زدہ ہوئے تو ایک بڈھے آدمی نے اُن سے کہا کہ اے میرے بچو اس بات کو یاد رکھو کہ اپنے آپ سے زیادہ خوفناک کوئی چیز نہیں ہے۔ خواب کی مانند دنیا کے اپنے معمولی خیالی واقعات

میں بھی انسان اپنے آپ کو ایک دیو کی مانند پاتا ہے مگر وہ اس بات کو نہیں جان سکتا کہ وہ اسی کی ذات ہے۔ کوئی نیکی جو معلوم ہوا اور اس کا بدی سے مقابلہ کیا جائے تو وہ خود انسان کی ایسی نیکی ہوتی ہے جیسے خاص اس کی بدی۔ ہر صفت اس کے ذہن کی کسی نہ کسی شخص کو اہم معلوم ہوتی ہے اور ہر جذبہ اس کے دل کا کسی نہ کسی کو بڑا معلوم ہوتا ہے۔ انسان اُن پانچ درختوں کی مانند ہے جو باغ میں اِس ترتیب سے لگائے جائیں کہ اگر ان کو چاروں سمتوں میں سے کسی سمت سے بھی دیکھا جائے تو وہ چوکور معلوم ہوں یا اِس کی مثال صنعتِ توشیح کی سی ہے یعنی کسی نظم یا غزل کے ابتدائی، درمیانی یا آخری حروف کو اگر ملایا جائے تو کوئی نہ کوئی نام بن جاتا ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو؟ اس وجہ سے کہ وہ ان کی اور اپنی پسند اور ناپسند کے مطابق ایک شخص سے وابستہ ہو جاتا ہے اور دوسرے کو چھوڑ دیتا ہے۔ وہ حقیقت میں اپنے مفاد کے لئے دوسروں سے میل جول رکھتا ہے اور اسی غرض سے تجارت میں، عادتوں میں، حرکات و سکنات میں کھانے اور پینے میں شریک ہو جاتا ہے۔ اگر تم اِن

باتوں کے ہر پہلو پر غور کرو تو اس کے نفع کا پہلو صاف نظر آتا ہے۔
جو کچھ وہ لکھتا ہے وہ سمجھ کر لکھتا ہے۔ جتنی ہماری سمجھ اور دریافت ہے بس ہم اتنے ہی ہیں۔ تم نے کسی ہوشیار آدمی کو ورجل پڑھتے دیکھا ہوگا۔ ہاں! اس مصنف کی یہ تصنیف ہزاروں آدمیوں کے کئی ہزار کتابیں ہیں۔ اس کتاب کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیلو غور سے پڑھو، مگر جو مطلب میں سمجھ سکونگا تم ہرگز نہ سمجھ سکوگے مثلاً اگر کوئی بالغ نظر عالم جو عقل وفہم میں اپنے آپ کو یگانہ روزگار سمجھتا ہو کتاب مذکور کے انگریزی ترجمہ کو بھی اسی حد تک سمجھ سکے گا جس حد تک کہ وہ کتاب کو مصنف کی اصلی زبان میں (زبانِ پہلو) میں دیکھکر سمجھتا۔ جو باتیں اچھی کتاب کے ساتھ مخصوص ہیں وہ ہی اچھے لوگوں کی جماعت کے ساتھ بھی مخصوص ہیں۔ ایک ذلیل آدمی کا اچھی سوسائٹی والے آدمیوں کے ساتھ تعارف کرا دیا جائے تو وہ ان کے لئے بیکار ہے اس لئے کہ وہ اُن کا ساتھی نہیں ہو سکتا۔ ہر سوسائٹی ایسے آدمیوں سے بچتی ہے۔ لوگ اس سے بالکل محفوظ ہیں، اس وجہ سے کہ وہ ان کی جماعت میں شریک نہیں ہے، اگرچہ

اس کا وجود اس کرے میں موجود ہے۔

طبیعت کے مقرر کردہ ازلی قوانین سے جنگ کرنے میں کیا فائدہ نکل سکتا ہے۔ انھیں قوانین کی بنا پر لوگوں میں ایک دوسرے سے بالترتیب تعلقات ہوتے ہیں۔ ہر شخص کی طبیعت میں یہ باتیں قدرت نے اس کی لیاقت اور قابلیت کی نسبت سے عطا کی ہیں جو بالکل جنچی تلی ہوتی ہیں۔ گرٹ روڈ گائی پر فریفتہ ہوگئی تھی اس وجہ سے کہ اس کے خیالات کیسے بلند تھے، اس کا کیسا امیرانہ ٹھاٹھ تھا، اسکے اطوار و خصائل کیسے رئیسوں کے سے تھے۔ ان وجوہ کی بنا پر گرٹ روڈ کا مقصد اولین یہ تھا کہ وہ گائی کی شریک زندگی ہو جائے۔ اسکی محبت اس کے لئے انمول تھی اور اس مقصد کی زمین و آسمان بھی تائید کرتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ گرٹ روڈ گائی کو حاصل کر کے اپنی دلی تمناؤں میں کامیاب ہوئی۔ لیکن اب گرٹ روڈ کو اس کے اعلیٰ خیالات، ممتاز امیرانہ ٹھاٹھ اور ارفع اطوار و خصائل سے کیا فائدہ جبکہ گائی کا میلان طبعی سینٹ میں ہے تھیٹر اور جوئے کی طرف ہے اور اب ان وجوہ کی بنا پر گرٹ روڈ کے دل میں اپنے حسین خسو سر کو پھر مسخر کرنیکے لئے

کوئی تمنا نہیں ہے اور نہ اس سے بات چیت کرنے کی کوئی آرزو۔
وہ اپنی سوسائٹی آپ پیدا کرلے گا۔ ہم سوائے نیچر کے اور کسی چیز سے محبت نہیں کرسکتے۔ ہماری نہایت عجیب وغریب فراست، نہایت قابلِ قدر جدوجہد بھی اس وقت کارآمد ہوتی ہے جب ہم فطرتی اصولوں کے مطابق یا ان کے لگ بھگ عمل پیرا ہوں اور پھر کس طرح بہتر طریقے پر آسانی سے ہم کامیاب ہوجاتے ہیں۔ اس کے برخلاف عمل کرنے سے ہماری ساری دانائی اور جدوجہد دھری رہ جاتی ہے۔ کیسے کیسے اچھے لوگ، باکمال لوگ اور ایسے لوگ جو حقیقت میں اپنی اچھائیوں اور کمال میں شہرۂ آفاق ہیں، ہمارے پاس آتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو لوگوں کی خدمت کے لئے ہر حیثیت سے وقف کردیتے ہیں، مگر اس بات سے بھی جیسا شاندار نتیجہ مترتب ہونا چاہیئے ویسا نہیں ہوتا۔ حقیقت میں ناشکری ہوگی اگر ہم ان کی بلند آواز سے تعریف نہ کریں۔ خیر جب یہ سب باتیں ہوچکتی ہیں تو ایک شخص جو ہم سے ذہنی مناسبت رکھتا ہے گویا وہ ہمارا فطری بھائی یا بہن ہے، ہمارے پاس بے تکلف اور خوش خوش آتا ہے، اور ایسا مانوس کہ گویا وہ ہماری

رگوں کا خون ہے، ہمیں اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز جو باعث کدورت تھی ہم سے دور ہو گئی، ہمیں بڑی سہولت ہوتی ہے، ہم خوش ہو جاتے ہیں۔ یہ کیفیت ایک قسم کی مسرت آمیز خلوت ہے۔ ہم سیہ کاری کے زمانہ میں حماقت سے یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم کو سوسائٹی کے دستور، اس کے لباس، اس کی تعلیم اور اُس کے قیاسات ضرور اختیار کر لینے چاہئیں۔ لیکن صرف وہ شخص میرا دوست ہو سکتا ہے جس کو میں یہ سمجھ لوں کہ وہ میرے ہی قدم بقدم چل رہا ہے۔ وہ شخص جس سے میں بچتا ہوں یا وہ شخص جو مجھ سے پرہیز کرتا ہے باوجود اس کے کہ وہ فرشتہ خصلت اور میرا ہموطن ہی کیوں نہ ہو اور میرے نام کی مالا ہی کیوں نہ جپتا ہو، میرا دوست نہیں ہو سکتا۔ ایک عالم اپنے آپ کو بھول جاتا ہے اور دنیا دار آدمیوں کی رسموں اور پوشاکوں کی نقل اس وجہ سے کرنے لگتا ہے کہ پسندیدگی کی نگاہیں اس کی طرف اٹھیں اور ایک وارفتہ مزاج کی چھوکری پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ اس شخص نے مذہبی تربیت ابھی اس حد تک نہیں پائی ہے کہ وہ اس بات کو سمجھ سکے کہ شریف عورت سیم تیم الطبعی حسن گفتار اور ہیئت ناتی

جیسی چیزیں کیا ہوتی ہیں - خیر جب وہ بڑا ہو جائے گا محبت اسکو خواہ مخواہ ہو جائے گی- مگر یہ یاد رہے کہ ان دو باتوں کی جیسی سخت سزا دی جاتی ہے ویسی اور کسی چیز کی نہیں دیجاتی' ایک یہ کہ ایسے رشتے کے حقوق سے غفلت کرنا جس سے سوسائٹی بنے اور دوسرے اس حماقت کی یعنی یہ کہ دوسروں کی نظروں سے اپنے رفیق زندگی کا انتخاب کرانا-

وہ اپنا ایک خاص انداز بھی مقرر کر سکتا ہے- یہ قول تمام وکمال تسلیم کرنے کے لائق ہے کہ جو رعایت جس شخص نے حاصل کر لی ہے گویا وہ اس کی ہوگئی- وہ مرتبہ اور طرز جو تمہارے اختیار میں ہے حاصل کرلو اور تمام دنیا اسے تسلیم کرلے گی- دنیا میں انصاف ہی ہوتا ہے- دنیا قطعی بے تعلقی کے ساتھ ہر شخص کو اپنی شرح خود مقرر کرنے کی اجازت دیتی ہے- کوئی نامور گرامی آدمی ہے یا محض لایعنی آدمی دنیا کبھی کسی کے معاملے میں شامل نہیں ہوتی- وہ تمہاری ذات اورافعال کے متعلق تمہارے ہی اندازہ کو قبول کرلے گی چاہے تم اپنے عمل کو چھپاؤ چاہے تم اس سے انکار کرو اور چاہے تمہارا نام ساتویں آسمان پر

مثل سیّارے کے گردش کرے۔

یہ ہی حقیقت ہر قسم کی تعلیم پر حاوی ہے۔ انسان عملی طور سے کسی کام کو کرکے دوسروں کو سکھا سکتا ہے، اس کے سوائے اور کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہے۔ جو بات وہ دوسروں کو سکھانا چاہے اس کا مجسم نمونہ بن جانا چاہیے، الفاظ کے ذریعہ یہ بات ناممکن ہے جو سکھاتا ہے وہ کچھ دیتا ہے اور جو سیکھتا ہے وہ کچھ پاتا ہے۔ جبتک طالب علم اس حالت اور اسی معیار پر نہ آجائے جو تمہارا ہے اس وقت تک کوئی تعلیم اسکو نہیں دی جاسکتی۔ مگر جب طالب علم اس حالت پر آجاتا ہے تو کسر و انکار واقع ہوتا ہے، تم وہ ہو جاتے ہو اور وہ تم ہو جاتا ہے، اور حقیقت میں تعلیم اسی حالت میں ہوسکتی ہے۔ اس طرح تعلیم پانے سے طالب علم کسی ناموافق موقع یا بری صحبت کے اثر سے بھی اس تعلیم کے فوائد نہیں کھو سکتا۔ اگر ان اصولوں کے خلاف اس نے تعلیم پائی ہے تو وہ تمھاری بتائی ہوئی باتونکو ایک کان سنے گا اور دوسرے کان اڑا دے گا۔ ہم نے یہ اشتہار میں دیکھا کہ مسٹر گرانڈ چوتھی جولائی کو تقریر کرینگے اور مسٹر ہینڈ ملکنس

سوسائٹی کے روبرو تقریر کرینگے۔ ہم ان تقریروں میں اس وجہ سے نہیں جاتے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ دونوں اشخاص اپنی ذاتی سیرت اور ذاتی تجربات کے متعلق پبلک میں تقریر نہیں کرینگے' اگر ہم کو بصورت دیگر اپنے خیال کے مطابق یقین ہو جائے تو ہم باوجود مخالفت اور تکلیف کے بھی ضرور جائیں گے۔ یہاں تک کہ بیمار لوگ پالکیوں میں بیٹھکر تقریر سننے کے لئے جائینگے۔ لیکن حق بات یہ ہے کہ عمومی تقریر' ایک شرارت' ایک فعل عبث' ایک نمونۂ معذرت اور ایک انداز خاموشی ہوتا ہے' کچھ آگاہی نہیں دیجاتی' نہ کوئی تقریر ہوتی ہے' نہ کوئی آدمی ہوتا ہے۔

بالکل اسی طرح ایک انتقامی تعزیر کا مسئلہ عقلی کاموں پر محیط ہے۔ ہم کو ابتک یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ جو باتیں الفاظ میں بولی گئی ہیں ان کی حقیقت کیا ہے۔ ان کو اپنی تصدیق خود کرنی چاہیئے اس وجہ سے کہ کوئی منطقی یا قسمیہ طریق گفتگو ان کی صداقت کی گواہی نہیں دے سکتی۔ جو فقرہ بولا گیا ہے' وہ اپنے بولے جانے کی صفائی خود پیش کرے گا۔

عام لوگوں کی طبیعت پر کسی تحریر کا جو اثر ہوتا ہے تو اسکی گہرائی خیالات پر بالکل صحت کے ساتھ ناپی جا سکتی ہے اور اس سے پھر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس نے کتنا اثر کیا۔ اس کے اثر سے اگر تم بیدار ہو جاؤ' یا یہ کہ وہ تمکو اپنی فصاحت کے زور سے رفعت و بلندی بخشے۔ تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کا اثر اور لوگوں پر بھی ہوگا' چاہے رفتہ رفتہ ہو یا ایک دم ہو اور اگر وہ صفحات تمھیں کوئی سبق نہیں دیتے تو اس کی نسبت یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ حشرات الارض کی طرح جلد فنا ہو جائینگے۔ بات کرنے اور لکھنے کا طریقہ جو کبھی پرانا نہ ہوگا یہ ہے کہ جو کچھ لکھا جائے وہ صداقت سے ہو۔ وہ محبت جس میں میرے لئے کلی ہونے کی قوت نہیں ہے تو اسکی کافی وجہ موجود ہے کہ وہ تم پر بھی کامیاب نہ ہوگی۔ اس کے لئے سڈنی کا مقولہ اختیار کرنا چاہیئے' "اپنے دل کو دیکھو اور لکھو"۔ وہ شخص جو دل سے سوچکر لکھتا ہے تو اس کی تحریر ابد تک قایم رہتی ہے۔ کوئی بات کوشش کرکے لکھو مگر تمھیں اسکے متعلق اطمینان ہونا چاہیئے پھر وہ شایع کرنے کے قابل ہے۔ جو مصنف سنی سنائی بات لکھتا ہے' سوچ سمجھ کر نہیں لکھتا تو اس کی تصنیف سے

یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جو کچھ اس نے سیکھا ہے اتنا ہی لکھ دیا ہے۔ اور
جب لوگ اس کوری کتاب کی تعریف کریں گے اور ایک گروہ کہے گا
کہ واہ! کیا اچھے شعر ہیں؟ کیا طبیعت پائی ہے۔ تو اس وقت بھی
اصلی قوت آنے کے لئے اسکے ضروری سامان کی کمی رہے گی۔ وہی
چیز نافع ہو سکتی ہے جو حقیقتاً نافع ہے۔ زندگی ہی زندگی بخش ہے اور
گو ہم ایک ہی وہم کیوں نہ ظاہر ہو جائیں کہ گویا یہ ٹھیک ہے کہ گویا ہم اپنے
آپ کو قابل بنا لیں گے ویسی ہی ہماری تحریریں ہوں گی۔ لکھ کر شہرت پانا
شہرت حاصل کرنا کوئی قسمت کی بات نہیں ہے۔ وہ لوگ جو ایک
کتاب کی خوبیوں کے متعلق آخری فیصلہ کرتے ہیں، تو وہ فیصلہ شور
و غل کرنے والی یا طرفداری کرنے والی جماعت کا نہیں ہوتا بلکہ وہ
فیصلہ جمہور کی سنجیدہ جماعت کا ہوتا ہے اور یہ ایسی جماعت ہوتی ہے
جس پر رشوت، خوشامد اور رعب و داب کے حربے کارآمد نہیں
ہو سکتے اور حقیقت میں اسی فیصلہ کی بنا پر علم و فضل میں شہرت نصیب
ہوتی ہے۔ صرف وہی کتابیں باقی رہتی ہیں جن کو بقا کا حق حاصل
ہو۔ ایسی کتابیں جن پر سنہرا حاشیہ ہو، اوراق بیش قیمت ہوں، یا

جن کی اعلیٰ درجہ کی جلد بندی ہوئی ہو اور اسی قسم کی بہت سی کتابیں جو کتب خانوں میں تحفتہً بھیجی گئی ہوں۔ ان میں سے ایک کتاب بھی ذاتی طور پر مقررہ وقت سے زیادہ قایم نہیں رہتی۔ ان کا وہی حشر ہوتا ہے جو وال پول نوبل اور شاہی مصنفین کی کتابوں کا ہوا۔ بلیک مور، کوٹز بو اور پولاک کی کتابیں ممکن ہے کہ بہ مشکل رات بھر کی مہمان رہ سکیں مگر حضرت موسیٰ علیٰ نبینا کی کتاب اور ہومر کی کتاب ہمیشہ قایم رہے گی۔ جو لوگ افلاطون کی کتابوں کو پڑھتے اور سمجھتے ہیں، دنیا بھر میں ایسے لوگوں کی تعداد ایک وقت میں بارہ سے زیادہ نہ نکلے گی۔ یہ تعداد ایسی ہے کہ اس کے ایک اڈیشن کو چھاپے کی قیمت بھی برداشت نہیں کر سکتی، پھر بھی انھیں لوگوں کی خاطر اس کتاب کی اڈیشن پر اڈیشن چھپتی چلی جاتی ہیں اور یہ خدا کا فضل معلوم ہوتا ہے۔ بینٹلی کا قول ہے کہ "کسی کتاب کو کسی نے نہیں لکھا ہے بلکہ وہ ضرورت اور وقت کے لحاظ سے لکھی گئی ہے"۔ دوستانہ کوششوں یا مخالفانہ کوششوں کی بنا پر تمام کتابوں کو استقلال نصیب نہیں ہوا ہے بلکہ ان کی دوام شہرت کا سبب ان کی مخصوص کشش

ہے یا یہ کہ ان کے مضامین کی مخصوص صفات نے لوگوں کی طبیعتوں پر مسلسل اثر کیا اور یہی ان کے استقلال اور شہرت کا باعث ہوا۔ میکائیل انجیلو نے ایک مصور یا بت تراش سے کہا تھا "کسی تصویر یا بت کی پسندیدگی کے لیے اطراف و جوانب سے روشنی ڈالکر پسند کرانے کی ضرورت نہیں ہے اس کو شاہ راہ پر رکھدو۔ اگر اس میں کوئی قابل تعریف بات ہوگی تو کھلی روشنی میں عوام اس کی خود قدر کریں گے۔"

اسی طرح سے ہر کام کا اثر اس جذبہ کی گہرائی سے جس نے اس کام کو پیدا کیا ہے ناپا جاسکتا ہے۔ بڑا آدمی اس بات کو نہیں جان سکا کہ وہ بڑا تھا۔ ایک یا دو صدیاں گزر جانے کے بعد لوگوں کو اس واقعہ کا علم ہوا۔ جو کچھ اس نے کیا کیا اس لیے کہ اس کا یہ ہی فرض تھا۔ دنیا میں اس کا اس کام کو انجام دینا قدرتی امر تھا اور یہ بات اس میں وقتیہ واقعات سے پیدا ہوئی تھی۔ لیکن اب اس کیے ہوئے ہر کام، چاہے اس نے اپنی انگلی ہی کیوں نہ اٹھائی ہو کھانا ہی کیوں نہ کھایا ہو، بڑے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کام ایک

دوسرے سے ملے ہوئے ہوتے ہیں اور انہیں کا مجموعہ لوگ تعلیم کا مرکز کہنے لگتے ہیں۔

کسی غیر معمولی فطری ذہانت کی چند جزویات تک پہنچتے ہیں۔ ان سے اس کے ندی کے بہاؤ کا رخ معلوم ہوتا ہے اور وہ ندی خون ہے جس کا ہر قطرہ زندہ ہے۔ صداقت کی فتوحات اکیلی نہیں ہوتیں بلکہ اور تمام چیزیں بھی اس کی معین و مددگار ہوتی ہیں یعنی صرف مٹی اور پتھر ہی نہیں بلکہ غلطیاں اور جھوٹ بھی اس کے معاونین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ حکماء کہتے ہیں کہ بیماری کے قوانین میں بھی وہی خوبیاں ہوتی ہیں جو صحت کے قوانین میں ہیں۔ ہمارا فلسفہ "اثبات" ہے جو نفی کے واقعات سے فوراً اس طرح اپنے اثبات کی شہادت لیتا ہے جس طرح ہر چیز کا سایہ سورج کا پتہ دیتا ہے۔ فطرت کا ہر کام قدرتی ضرورت کی بنا پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ مخالف واقعات سے اپنے صداقت کی شہادت لے۔

انسان کی سیرت ہمیشہ اپنے آپ کو ظاہر کرتی رہتی ہے۔

فعل یا قول کی روانی، محض کسی کام کا انداز، کسی مقصد کا ذکر، ان سب باتوں سے انسان کی سیرت ظاہر ہوتی ہے۔ اگر تم کوئی کام کرو تو اس سے تمھاری سیرت ظاہر ہوگی اور اسی طرح تمھارے خاموش بیٹھنے اور سونے سے بھی۔ لوگوں نے تقریریں کیں اور تم اس وقت کچھ سوچتے اور خیال کرتے رہے، تم نے زنانہ، گرجا، غلامی، شادی، معاشرت، خفیہ جماعتوں، کالج اور لوگوں کی جماعتوں کے متعلق کسی قسم کی اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ جب تک تم خاموش رہو گے اس وقت تک لوگوں کے دل میں ایک قسم کا تعجب رہے گا کہ خدا جانے تم کیا کہوگے اور ابتدائے تقریر تک تمہارا یہ انداز ایک محفوظ حکمت ہے۔ اس کے برخلاف اگر اور غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمھاری خاموشی بہت بلند آواز سے گفتگو کرنے کا پتہ دے رہی ہے۔ یہ سچ ہے کہ تم کوئی پیشن گوئی نہیں کروگے اور تمھارے ساتھیوں کو بھی اس کا علم ہے کہ تم ایسا نہیں کرسکتے اس وجہ سے کہ پیشن گوئیاں خود منہ سے بولا کرتی ہیں۔ کیا دانشمندی خود بلند آواز سے نہیں بولا کرتی اور کیا سمجھ اسکی آواز کی تائید نہیں کرتی؟

مکروفریب کی قوتوں کے لئے نیچر نے بڑی زبردست قیود عائد کی ہیں۔ جسم کے اعضا پر صداقت جبراً حکمرانی کرتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ چہرے سے حقیقی بات ظاہر ہوجایا کرتی ہے۔ جو لوگ چہرہ کی تبدیلیوں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں وہ کبھی دھوکا نہیں کھاتے۔ جو شخص سچ کی حیثیت سے سچ بولتا ہے اس کی آنکھیں آسمان کی مانند شفاف رہتی ہیں مگر جب اس کے دل میں کوئی بدی ہوتی ہے تو اس کی آنکھیں مکدر ہوجاتی ہیں اور وہ کن انکھیوں سے دیکھتا ہے۔

میں نے ایک تجربہ کار وکیل کی زبانی سُنا ہے کہ ایسے وکیل کے رعب کا کوئی اثر جوری پر نہیں ہوتا جس کو اپنے دل میں یہ یقین نہیں ہے کہ اس کے موکل کے حق میں فیصلہ ہوگا۔ اگر اس وکیل کو یہ یقین نہیں ہے تو اس کا عدم یقین باوجود اس کے انکار کے بھی جوری پر ظاہر ہوجائیگا اور ان کا یقین بھی عدم یقین ہوجائے گا۔ یہ وہ قانون ہے جس کے ذریعہ سے ایک صنعت خواہ وہ کسی قسم کی ہو دیکھنے والوں کے دل میں وہی کیفیت پیدا کرتی ہے جو کہ صنّاع کے دل کی بناتے وقت تھی۔ جس بات کا ہم یقین نہیں کرتے تو اس کے متعلق ہم یقینی

طور پر کوئی بات نہیں کہہ سکتے، گو ہم الفاظ کو کتنی ہی مرتبہ کیوں نہ دہرائیں
یہ یقین ایسا تھا جس کو سویڈن برگ نے اس وقت ظاہر کیا تھا جب
اس نے انسان کے ایک گروہ کا قصہ روحانی دنیا میں ایک الٰہیاتی مسئلہ
کی بیفائدہ تحقیقات کے متعلق جس کا وہ یقین نہیں کرتے تھے، بیان
کیا تھا۔ لیکن باوجود کوشش کے بھی وہ اس کو دریافت نہ کر سکے اگرچہ
اس ناکامی کی وجہ سے وہ اپنا ہونٹ چبا لیا کرتے تھے اور غصہ سے اُن
کی بُری حالت ہو جایا کرتی تھی۔

ہمارے کسی کام کی اہلیت کے متعلق لوگوں کا جو خیال ہوتا ہے،
اس پر ہمارا تعجب کرنا بے کار ہے اور اسی طرح جو لوگ ہمارے کسی کام
کی اہلیت کے متعلق ہم سے ناواقف ہیں، اس سے ہمارا خوف بھی
بیفائدہ ہے۔ اگر کوئی شخص یہ جان لے کہ وہ کوئی کام کر سکتا ہے یعنی
یہ کہ وہ اس کام کو دوسروں کی بہ نسبت اچھا کر سکتا ہے، تو وہ اس
واقعہ سے یہ سمجھتا ہے کہ گویا تمام آدمیوں کی طرف سے اُس کو اس
کام کی قبولیت کا وثیقہ مل گیا۔ دنیا کا ہر روز روزِ محشر ہے۔ انسان
جب کسی جماعت میں داخل ہوتا ہے اور اس جماعت میں جس کام

کے کرنے کی کوشش کرتا ہے تو ہر کوشش میں وہ پرکھا جاتا ہے اور
اچھے یا بُرے ہونے کی اس پر مہر ثبت کر دی جاتی ہے۔ کسی احاطے یا
کھیل میں جہاں بچے کھیل کود رہے ہوں، چیخ چلا رہے ہوں، وہاں
اگر کوئی نیا بچہ آجائے تو چند روز تک اس کو بچے جانچتے رہتے ہیں۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا بچے اس دوران میں اس کی طاقت،
ہنر اور مزاج کی ٹھیک ٹھیک جانچ کر لیتے ہیں۔ ایک اجنبی لڑکا
کسی دور کے مدرسے سے جب کسی مدرسہ میں داخل ہونے کے لئے
آتا ہے، اس کی جیبوں میں نمائشی چیزیں بھی ہوتی ہیں اور غرور
اور تبختر سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اس لڑکے کی ان سب باتوں کو
دیکھ کر اس سے بڑی عمر کا لڑکا اپنے دل میں کہتا ہے کہ ان باتوں
سے کیا کام چلتا ہے، کل ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ کتنے پانی میں
ہے۔ "اس نے کیا کیا ہے؟" یہ سوال قدرتی طور سے انسانوں کو
تلاش کرتا رہتا ہے اور ہر جھوٹی شہرت کو خاک میں ملا دیتا ہے۔
ایک بانکا جہاں چاہے اجلاس کرے مگر وہ اپنے وقت میں ہومر
اور واشنگٹن سے کبھی ممتاز نہیں ہو سکتا، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ

انسانوں کی مختلف قابلیتوں کے متعلق کبھی کو کبھی شک و شبہ کی گنجایش نہیں ہو سکتی۔ جھوٹا دعویٰ بجائے خود موجود رہتا ہے، مگر کارگر نہیں ہو سکتا۔ جھوٹے دعوے سے کبھی کوئی بڑا کام نہیں ہوا ہے۔ جھوٹا دعویٰ کرنے والوں نے کبھی الیاڈ جیسی کتاب نہیں لکھی ہے، یہ لوگ نہ اردشیر کو بھگا سکے، نہ مذہب کی تبلیغ کر سکے اور نہ کبھی غلامی کا انسداد کر سکے۔

انسان میں جتنی نیکی ہوتی ہے اتنی اس سے ظاہر بھی ہوتی ہے۔ انسان میں جتنی اچھائی ہوتی ہے اتنی ہی لوگ اس کی عزت بھی کرتے ہیں، یہاں تک کہ شیطان بھی نیکی کا احترام کرتے ہیں۔ انسانوں کا وہ فرقہ جو بلند خیال ہو فیاض ہو اور اپنے آپ کو نیکیوں کیلئے وقف کر دے وہی ہمیشہ انسانوں کو ہدایت کریگا اور ان پر حکومت بھی کریگا۔ قابلِ احترام بات نہ کبھی قطعی ضائع ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ بلند ہمتی کبھی بیکار ثابت نہیں ہوتی ہے۔ کوئی نہ کوئی شخص اس کو مبارکباد دیکر امید کے خلاف قبول ہی کر لیتا ہے۔ جیسا آدمی ہوتا ہے ویسا ہی وہ سمجھا بھی جاتا ہے۔ وہ جس قسم کا ہوتا

ہے، اُس کے چہرے، اُس کے انداز، اُس کی طرزِ معاشرت سے صاف ظاہر ہوجاتا ہے۔ ان باتوں کو وہ چھپا نہیں سکتا، نہ اُس کی لاف زنی سے کچھ فائدہ ہوتا ہے۔ ان باتوں کے اظہار کا ہماری آنکھیں، ہماری ہنسی، صاحب سلامت اور ہاتھ کی گرفت آئینہ ہوتی ہے۔ اس کی سیاہکاریاں اس کو تباہ کردیتی ہیں، اور لوگوں اُس کی طرف اچھے خیالات قائم کرنے سے روکتی ہیں۔ انسانوں کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کا کیوں اعتبار نہیں کرتے مگر وہ اعتبار نہیں کرتے۔ اس کی آنکھیں اسکی سیاہ کاریوں کا عکس ہوتی ہیں، جو اُس کے رخساروں پر جھریاں پیدا کرتی ہیں، اس کی ناک کو نیچا کرتی ہیں اور اس کے سر کے پیچھے بہیمانہ صورت پائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بدکار بادشاہ کی پیشانی پر بھی "احمق بیوقوف" لکھا ہوتا ہے۔

اگر تم جانتے ہو کہ لوگ تم کو کسی کام کا اہل نہ سمجھیں گے تو اُس کام کو ہرگز نہ کرو۔ ایک شخص جنگل میں بھی جاکر حماقتیں کرے، لیکن اُس کو ایسا معلوم ہوگا کہ اس کی حماقتیں ریت کا ہر ذرّہ دیکھ رہا ہے۔ وہ تنہا خور ہی کیوں نہ ہو، مگر وہ اپنی حماقتوں سے وہاں بھی باز نہیں رہ سکتا۔

چین جبیں، بدنظری، نازیبا افعال اور جہالت یہ سب لغویات ہیں۔ کیا ایرا غیرا، نتھو خیرا کبھی جنید اور بوعلی سینا سمجھا جا سکتا ہے؟ - کنفیوشس کی زبان سے یہ فقرہ بے اختیار نکل گیا تھا کہ "آدمی کسطرح چھپ سکتا ہے" "آدمی کس طرح چھپ سکتا ہے"۔

برخلاف اس کے شجاع کہیں ڈرتے ہیں۔ اگر وہ اپنی نیکی اور بہادری کے کاموں کا لوگوں پر اظہار نہ کرے تو اس کو یہ خوف نہیں ہوتا کہ اگر میں ان کاموں کو بیان نہ کرونگا تو لوگ مجھے کیا جانیں گے اور کیا سمجھیں گے کہ میں نے کیا کیا۔ لیکن ان کو وہ خود تو جانتا ہے اور اس اطمینان کی شیرینی اور مقصد کی عظمت سے لازمی طور پر بہرہ مند ہے جو اس واقعہ کو بیان کرنے کی نسبت آگے چلکر زیادہ عام اور بہتر اعلان ثابت ہوگا۔ نیکی اشیاء کی فطرت کے مطابق کام کرنے کا نام ہے اور یہی اشیاء کی فطرت اس نیکی کو پھیلاتی ہے۔ آدمی یہ ہم نظر آنے کی بجائے حقیقتاً ہو جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی نسبت نہایت خوب کہا گیا ہے کہ وہ فرماتا ہے "میں ہوں" (اِنِّیْٓ اِنَّ اللہ)

ان مشاہدات سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہم میں نمود نہیں بلکہ

اصلیت ہونی چاہیئے۔ ہمیں سرِ تسلیم خم کرلینا چاہیئے۔ زبانی علوم کے رموز و دقائق میں سے ہمیں اپنی پرشِختت بے حقیقی کو نکال لانا چاہیئے۔ اچھا آؤ اب ہم دنیاوی عقلمندیوں کو بالائے طاق رکھدیں۔ اچھا آؤ اب ہم خدائی طاقت کے آگے سرنگوں ہوجائیں اور یہ سبق حاصل کریں کہ صداقت ہی ہمیں دولتمند اور بڑا بنا دیتی ہے۔

اگر تم اپنے کسی دوست سے ملنے کے لئے جاؤ تو تمھیں اس بات کی کونسی ضرورت ہے کہ تم اس سے اپنے ملنے کے لئے نہ آنے کی معذرت کرکے اُس کا وقت ضایع کرو اور خاص اپنے کام کو بھی بگاڑ دو۔ اس سے اب مل لو۔ اسے یہ محسوس کرنے دو کہ جو کچھ محبت تمھارے دل میں ہے وہ اسی کی ہے۔ یا تمھیں اور تمھارے دوست کو اس بات کیلئے خود کو دل ہی دل میں لعنت وملامت کی تکلیف اٹھانے کی کونسی ضرورت ہے کہ تم نے ابتک اس کی مدد نہیں کی ہے یا اس سے ابتک پیام وسلام یا تحفے تحائف بھیجنے کا سلسلہ کیوں جاری نہیں رکھا۔ اب اس ہی ملاقات کے وقت خود تحفہ اور دعا ہو جاؤ۔ تم جیسے ہو ویسے ہی تمکو ظاہر بھی ہونا چاہیئے۔ بناوٹ کا اس میں شائبہ تک نہ ہو۔ معمولی حیثیت کے آدمی

بڑے آدمیوں کے ممنون ہوا کرتے ہیں، اُن کے آگے سرِ تسلیم خم کیا کرتے ہیں، اُن سے بڑی بڑی معذرت کیا کرتے ہیں اور ان باتوں کیلئے بہت سے ذرائع فراہم کیا کرتے ہیں۔ یہ سب باتیں اس لئے کرتے ہیں کہ انکی کوئی اصلیت نہیں ہوتی۔

ہم اس قسم کی لغویات میں اس قدر پھنسے ہوئے ہیں کہ گویا ہم مرتبہ کو پوجتے ہیں۔ ہم شاعر کو انھیں وجوہ سے سُست اور کاہل کہتے ہیں کیونکہ وہ کسی جماعت کا صدر نشین نہیں ہوتا، تاجر یا قلی نہیں ہوتا۔ ہم ایک تعلیم گاہ کی تعریف تو کرتے ہیں مگر اس بات پر غور نہیں کرتے کہ اس کی بنیاد انھیں خیالات پر رکھی گئی ہے جو ہمارے دل میں موجود ہیں۔ بلکہ ہمیں یہ خیال کرنا چاہیئے کہ بڑے کام خاموشی سے ہوا کرتے ہیں۔ ہماری زندگی کی منازل، ہماری کسی زندگی کے شعبے مثلاً ہماری شادی، کسی عہدے کا ملنا اور اسی قسم کی باتوں کے اختیار کرنے سے، ظاہری صورت نہیں اختیار کرتیں بلکہ یہ سب باتیں ہم جس راستے پر چل رہے ہیں اس راستہ پر خاموش خیالات کی بناء پر اختیار کرتے جاتے ہیں اور وہ خیال ایسا ہوتا ہے جس سے ہماری زندگی کی ہر منزل پر نظرِ ثانی ہو جاتی ہے اور

وہ خیال کہتا رہتا ہے کہ "تو نے اس کام کو اس طرح کیوں کیا، تجھے اِس طرح کرنا چاہیئے تھا۔" سنین ماضیہ اس کے لئے خدمتگاروں کی مانند ہماری خدمت کرتے رہتے ہیں اور ہم اس سنین کی قابلیت کے لحاظ سے انکی مرضی کے مطابق عمل پیرا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ نظرِ ثانی یا غلطیوں کی تصحیح ایک قسم کا مسلسل زور ہوتا ہے جس سے ہمیں زندگی بھر اس قسم کی رغبت ہوتی رہتی ہے۔ ان اوقات میں انسان کا مقصد ایسا ارفع ہو جاتا ہے جس سے اس کے اندرونی حواس بیدار ہو جاتے ہیں اور خدائی قانون اس کے اوپر بغیر کسی رکاوٹ کے محیط ہو جاتا ہے اور پھر خواہ اُس کا کوئی ذاتی کام ہو، اُس کا گھر ہو، اس کی مذہبی باتیں ہوں، اُس کی سوسائٹی ہو، اُس کا تبسم ہو، اُس کی رائے ہو، یا اس کی مخالفت ہو۔ اس کی ان باتوں میں سے کسی پر بھی جب کبھی تم نظر ڈالو گے تو اُس کی سیرت سے حقیقی بات ظاہر ہوگی۔ بحیثیت موجودہ اس میں یکسانی نہیں ہے بلکہ وہ متضاد اوصاف کا مجموعہ ہے اور شعاع ربانی اس پر نہیں پڑی ہے اور اس کے انوار سے وہ بلا واسطہ فیضیاب نہیں ہوا ہے، لہذا دیکھنے والے کی آنکھ متحیر ہے کہ اسے اس شخص میں مختلف

اور متباین کیفیتیں نظر آتی ہیں اور اس کی زندگی ابھی تک ایک نقطہ خیال پر قایم نہیں ہوئی ہے۔

ہم اپنی جھوٹی خاکساری سے جو کچھ ہم ہیں اور جو صورت ہمارے لئے زیبا ہے اسے بُرا کہنا یا حقیر جاننا کیوں ضروری سمجھیں؟ بہرحال ایک اچھا آدمی اپنی حالت پر مطمئن ہے میں اپاجی تنداز سے محبت کرتا ہوں اور اس کی وقعت کرتا ہوں مگر میں اپاجی تنداز ہونا نہیں چاہتا۔ یہ زیادہ منصفانہ بات ہو کہ اس زمانہ کو بہ نسبت اس زمانہ کے پسند کیا جائے۔ اگر میرا خیال صحیح ہو تو تم مجھکو یہ کہکر بےچین نہیں کرسکتے کہ "وہ کام میں مصروف رہا اور تو خاموش بیٹھا ہے"۔ جب کام کی ضرورت ہے اس وقت کام کرنا میرے خیال میں اچھا ہے اور جس وقت خاموش رہنے کی ضرورت ہے اس وقت خاموش رہنا بھی اچھا ہے۔ اپاجی تنداز کو جیسا میں خیال کرتا ہوں اگر وہ ایسا ہی تھا تو اس صورت میں اگر اس کا نقطہ خیال ایسا ہوتا جیسا میرا ہے تو وہ بھی میری طرح ایسا ہی امن و آسایش سے خاموش بیٹھتا۔ عالم بہت وسیع ہے اور اس میں محبت اور مہربانیوں کی بہت گنجائش ہے تو پھر ہم کیوں مصروف رہیں

اور غیر معمولی طور پر کیوں اعلیٰ کام کریں؟ صداقت کے لئے کام کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر ہیں۔ لکڑی کا ایک ٹکڑا اس آلے میں بھی لگا سکتے ہیں جس سے ہوا کا رُخ دیکھا جاتا ہے اور ایک ٹکڑا ہل کے دا ہنے میں مگر لکڑی کی صفت دونوں میں ظاہر ہے۔

میں یہ نہیں چاہتا کہ رُوح کی بے حرمتی کروں۔ یہ واقعہ کہ میں موجود ہوں اس سے حقیقت میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ روح کو یہاں کسی مظہر کی ضرورت ہے۔ کیا میں رُوح کا مظہر نہ بنوں؟ کیا میں اس واقعہ کے اظہار میں بے محل معذرتوں اور لایعنی خاکساری سے جھجکوں اور جھجکوں؟ اور کیا میں یہ خیال کروں کہ میرا وجود بے محل ہے؟ کیا اس جگہ اپنے وجود کو ایا جی تنداز اور ہومر کے وجود کے مقابلہ میں بیحل اور مہمل سمجھوں؟ اور یہ کہ کیا روح اپنے لوازم کو نہیں پہچانتی؟ بس اس کے علاوہ اور مجھے کوئی بے اطمینانی نہیں ہے اس وجہ سے کہ لطیف رُوح مجھے پرورش کرتی ہے اور ہر روز قوت کے نئے خزانے میرے لئے کھولتی رہتی ہے۔ میں جاہلانہ طور پر نیکی کی کثرت سے انکار نہیں کرونگا اس وجہ سے کہ میں نے سنا ہے کہ نیکی دُوسروں کو دُوسری صُورت

میں عطا کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ ہم کام کے نام سے کیوں ڈریں۔ یہ ہماری حیثیات کا صرف ایک تماشا ہے، بس اس کے سوائے اور کچھ نہیں ہے ہم جانتے ہیں کہ ہر کام کا منبع خیال ہوتا ہے ایک کمزور دماغ رکھنے والا شخص اُس وقت تک اپنے آپ کو کچھ نہیں سمجھتا جب تک کہ اُس کو کوئی بیرونی مدد نہ ملے، یعنی جب تک اُس کے لئے جنٹیو کی مانند کھانے پینے کا سامان مہیّا نہ ہو، کیوٹر کا سا لباس نہ پہنتا ہو، یا کیتھولک کی مثل نماز میں شریک نہ ہوا ہو، فلسفے کی سوسائٹی کا ممبر نہ ہو، یا قدرتی طور پر کوئی بڑا آدمی نہ ہو، کوئی مقتدر عہدہ دار نہ ہو، یا جب تک اُس کے دل میں جہالت کے متضاد خیالات اس امر کی تصدیق نہ کردیں کہ من چیزے ہستم۔ برخلاف اس کے ایک تربیت یافتہ شخص مذہبی خوشی زندگی بسر کرتا ہے اور یہ ہی بات عین مقتضائے فطرت ہے۔ حق تو یہ ہے کہ ہر کام خیال ہی کی بناء پر ہوتا ہے۔

اگر ہم بڑے کام کرنا چاہیں تو ہم کو ویسا ہی اپنے آپ کو بنا لینا چاہیئے۔ تمام کاموں میں قدرتی طور پر اعلیٰ سے اعلیٰ کام ہونے کی

قابلیت پوشیدہ رہتی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا کام کیوں نہ ہو اس میں
بھی بڑے سے بڑا کام ہونے کی قابلیت موجود رہتی۔ ہم کو مستقل
مزاج اور مستعدی رہنا چاہیئے۔ اپنے فرائض کو ہمیشہ محسوس کرنا چاہیئے۔
جب تک میں اپنے محسنوں کی نظروں میں ہیچ نہ جاؤں اُس وقت
تک مجھے یونانیوں کے فلسفے اور اطالیوں کی تاریخوں کی ورق گردانی
کرنے کی کونسی ضرورت ہے؟ جب میں نے خود اپنے ہی جواب طلب
خطوں کا جواب نہیں دیا ہے تو پھر ایسی صورت میں مجھے شاہنامہ
فردوسی کے پڑھنے کی کیسے جرأت ہو سکتی ہے۔ کیا یہ ہی اعتراض
ہمارے طریقۂ مطالعۂ کتب پر وارد نہیں ہوتا؟ اپنے کاموں سے
بے اعتنائی کرنا اور دوسروں کے کاموں کے کھوج میں رہنا
بزدلی ہے۔ یہ قول درست بات ہے۔ بائرن نے جیک پینگ کے
متعلق کیا خوب کہا ہے :-

"کسی بات کے جواب دینے سے جب وہ عاری ہو گیا تو
اُس نے فوراً قسم کھالی"۔

یہی بات میں اپنی کتابوں کو بے معنی استعمال کرنے کے متعلق

کہہ سکتا ہوں۔ چونکہ اسے کوئی کام نہ تھا اس لئے وہ پڑھنے لگا۔ میں ہمیشہ خیال کرسکتا کہ میں کیا کروں، اور اسی خیال کی بنا پر مجھے برانٹ کی سوانح پر غور کرنے کا موقع ملتا ہے۔ برانٹ یا جنرل سوشٹر یا جنرل واشنگٹن کے متعلق یہ بات کہنا ان کے لئے بہت تعریف کی بات ہوگی۔ میرا وقت اتنا ہی قیمتی ہے جتنا اُن کا وقت تھا، میری باتیں میرے رشتے اور روابط اتنے ہی اچھے ہیں جیسے اُن کے تھے یا اُن میں سے کسی کے تھے۔ مجھے اپنا کام اسقدر خوش اسلوبی سے کرنا چاہئیے کہ کاہل لوگ اگر چاہیں تو ان لوگوں کے طرز عمل سے میرے کام کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور ایسا کرنے کے بعد وہ ان کے بہترین کام سے میرے کام کی مطابقت پائیں گے۔

پال اور پیر کسالیز کی قابلیتوں کا اصلیت سے زیادہ اندازہ کرنا اور اپنی قابلیتوں کا اصلیت سے کم اندازہ کرنا۔ یہ دونوں باتیں واقعات کی فطرتی مطابقت میں غفلت کرنیکی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ بوناپارٹ صرف ایک صفت سے متصف تھا اور وہ اپنے سپاہی کو، اچھے نجومی کو، اچھے شاعر کو اور فن حرب کے ماہر کو ایک ہی نظر سے دیکھتا تھا۔ شاعر قیصر

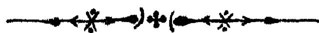
اور تیمور لنگ کا، نپولین کا، اور بلیسریس کا ان کی شہرت کی وجہ سے نام لیتے ہیں۔ مصور، ورجن میری، پال اور پیٹر کے مشہور واقعات کا حوالہ دیتے رہتے ہیں۔ شاعر فطرتاً ان مخصوص اور جری آدمیوں کے گروہ کی فطرت کے ماتحت کام نہیں کرتا۔ اگر شاعر ایک اصلی ڈرامہ لکھے تو اس صورت میں اس کو واقعی قیصر ہو جانا پڑتا ہے اس کا کھیل کھیلنے والا نہیں ہوتا اور پھر اس حالت میں اس کے قیصر کے سے خیالات ہو جاتے ہیں یعنی اس کے خالص جذبات ہو جاتے ہیں، سمجھ نہایت اچھی، حرکات و سکنات نہایت سریع، سواری نہایت شاہانہ، اخراجات نہایت وسیع، حوصلہ نہایت بڑا، اپنی ضرورتوں کو خود پورا کرنے والا، نڈر۔ اس کی محبت اور امیدوں کی لہروں میں وہ یہ سب باتیں حاصل کر لیتا ہے جو اس دنیا میں قیمتی اور باوقعت خیال کی جاتی ہیں یعنی محلات، باغات، روپیہ، جہازوں کے بیڑے، سلطنتیں۔ انسانوں کی نمائشوں کو حقارت سے دیکھنے پر اسکی بڑی قدر و منزلت ظاہر ہوتی ہے۔ ان سب چیزوں پر اس کو اچھی طرح قابو ہوتا ہے اور اسی کو مدنظر رکھ کر وہ قوموں کو بیدار کرتا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ صرف خدا پر اعتماد رکھے، مقامات اور لوگوں کی عارضی عظمت

میں کیا رکھا ہے۔ اچھا ہے کہ کسی کی متبرک روح کسی ایسی بڑھیا کی شکل میں جنم لے جو بہت ہی غریب، مفلس اور بیکس ہو اور جو خلق اللہ کی خدمت میں مصروف رہے مگر اسکی بزرگی اور پارسائی چھپ نہ سکیگی اور جب ایسا ہوگا تو اسکی بینا قابلِ توجہ خدمت بڑا اور بہتر کام متصور ہونے لگیگا، اور وہ ایسا کام ہوگا جس کو لوگ قابلِ تقلید سمجھیں گے اور کرنے لگیں گے اور پھر دیکھو وہی روح پھر یکایک کسی دوسری شکل میں جلوہ گر ہوگی اور کوئی دوسرا کام کریگی اور اب وہ انسانوں کی سرتاج کہلانے لگے گی۔

حق تو یہ ہے کہ ہم ہی روشنی پیما ہیں، ہم ہی طلائی پتروں والے نازک برق پیما ہیں اور ہم ہی رنگین ورق ہیں جس سے ہم عنصر لطیف کو جانچتے اور تولتے رہتے ہیں۔ ہم عشقِ حقیقی کی حقیقی آگ سے واقف ہیں جو خواہ کسی بھیس میں بھی رونما ہو مگر ہم اسکو پہچان لیتے ہیں۔ فقط

لا اعلم

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش — من انداز قدت را می شناسم



دوستی

از لارڈ بیکن

"جو شخص عزلت سے خوش ہوتا ہے وہ یا تو جانور وحشی ہے یا عارف باللہ ہے" جس کا یہ قول ہے اس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اُس نے حقیقت سے زیادہ جھوٹ اور سچ کو بہ نسبت لمبی چوڑی تقریر کے مختصر الفاظ میں ملا دیا ہے۔ کیونکہ یہ حقیقی واقعہ ہے کہ اگر کوئی شخص جو طبعاً صحبت سے متنفر اور بیزار ہو تو اس میں کچھ نہ کچھ بہمیت ضرور ہوگی، لیکن یہ واقعہ بھی حقیقت سے کوسوں دور ہے کہ اس میں کوئی نہ کوئی بات ایسی ہو جو عارفوں میں پائی جاتی ہے، سوائے اس صورت کے جبکہ یہ جذبہ صرف تنہائی کی خواہش کا نتیجہ نہ ہو۔ بلکہ ممکن

ہے کہ ان باتوں سے اس کا مقصود صفائے باطن اور علمِ معرفت کی اعلیٰ تحصیل ہو۔ علمِ معرفت کی تحصیل کا جھوٹا اور بناوٹی میلان بُت پرستوں مثلاً (اپی مینی ڈیز) جو کینڈا کا رہنے والا تھا' (نوما) جو رُوما کا باشندہ تھا' (ایمپی ڈوکلیس) جو سسلی کا رہنے والا تھا' اور (اپولونیس) جو اہل ٹیانا میں سے تھا' میں پایا گیا ہے اور علمِ معرفت کی تحصیل کا حقیقی میلان بعض راہبوں اور بہت سے اسقفوں میں پایا گیا ہے۔ لیکن لوگ اس بات سے کم واقف ہیں کہ عزلت کسے کہتے ہیں اور کتنے لوگ اسے پسند کرتے ہیں۔ اس لئے کہ جہاں آپس میں محبت نہ ہو وہاں انسانوں کا اجتماع نتیجہ خیز صحبت نہیں ہے' آدمیوں کی صورتیں مجسمے (بت) ہیں اور ان کی گفتگو ناگوار باجوں کی آوازیں ہیں۔ ایک لاطینی ضرب المثل سے اس حقیقت پر کچھ کچھ روشنی پڑتی ہے کہ "بڑی بستی سخت تنہائی" ۔ بڑے شہروں میں وسعت آبادی کی وجہ سے دوست دور دور رہتے ہیں' اس لئے اتحاد جیسا چھوٹی آبادیوں میں ہوتا ہے ویسا بڑے شہروں میں نہیں ہوتا۔ بلکہ اسکے لئے ہم اتنا اور اضافہ کر سکتے ہیں اور نہایت یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ

دوست صادق کے بغیر آدمی کے لئے دنیا سنسان اور ہو کا میدان ہے اور تنہائی کی سخت مصیبت کا سامنا ہے۔ اور اگر ہم عزلت کے یہ معنی لیں کہ جو کوئی بمقتضائے فطرت وطبیعت کسی کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتا تو اس کے لئے یہ سمجھنا چاہیئے کہ اس میں بہ نسبت انسانیت کے حیوانیت زیادہ ہے۔

دوستی سے جو نفع پہونچتا ہے وہ یہ ہے کہ اُن خیالات سے جو مختلف اسباب سے پیدا ہو کر دل کو مکدّر اور پریشان کر دیتے ہیں انسان کو چھٹکارا اور نجات ملجاتی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ جس وقت ہمارے جسم کے اندر مواد کا اجتماع و احتباس ہوجاتا ہے تو کیسے کیسے مہلک امراض پیدا ہوجاتے ہیں۔ پس یہ ہی حال نفس کا بھی ہے۔ جگر کے فتور کو رفع کرنے کے لئے عشبہ استعمال کر سکتے ہیں، طحال کے لئے فولاد، دماغ کے لئے کوئی مقوی دماغ دوا۔ مگر دل کے علاج کے لئے سوائے دوست صادق کے اور کوئی دوا نہیں ہے، جس سے تم اپنا غم، اپنی خوشی، اپنا خوف، اپنی امید، اپنے شبہات، اپنی رائیں، غرض کوئی بات بھی جو باعث کدورت ہو دل کھول کے صاف صاف نہ کہہ سکتے ہو۔

یہ عجیب بات جس کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں، غور طلب ہے کہ دوست صادق کو حاصل کرنے کیلئے بڑے بڑے سلاطین اور بادشاہوں نے کس قدر بڑی قیمت قرار دی ہے۔ یعنی ایسی بڑی قیمت ٹھہرائی ہے کہ انھوں نے اکثر اس کے لئے اپنی جان و مال تک کا داؤں لگا دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بادشاہ کے مرتبے اور رعایا و ملازمین کے مراتب میں ایسا فرق ہوتا ہے جو بادشاہ اور رعایا میں دوستی کے تعلقات کے مانع ہوتا ہے۔ اس رکاوٹ کو رفع کرنے کیلئے بعض اشخاص کو بڑھا کر گویا اپنا برابر والا بنانا پڑتا ہے اور اس کے لئے بادشاہوں کو بیشتر مصائب کا سامنا ہوتا ہے۔ ان مصاحبوں کو جدید زبانوں میں "منھ چڑھے" یا "درباری لوگ" کہتے ہیں ان لوگوں پر بادشاہ کی خاص عنایت ہوتی ہے یا یہ کہئے کہ یہ اس سے خصوصیت رکھتے ہیں۔ مگر رومانی زبان میں جو ان مصاحبوں کے لئے اصطلاح وضع کی گئی ہے اس سے ان کا اصلی کام ظاہر ہوتا ہے یعنی "شریکِ افکار" اس وجہ سے کہ بادشاہ ان کو اسی لئے اپنا انیس و جلیس رکھتا ہے۔ اور ہمیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ ایسا نہ صرف کمزور اور آشفتہ مزاج بادشاہوں

نے کیا ہے بلکہ ایسے بادشاہوں نے بھی اس پر عمل کیا ہے جو دانشمندی اور سیاست میں شہرۂ آفاق مانے گئے ہیں اور جنھوں نے اپنے آپ کو ایسا نہیں بنایا اور ایسے روابط قائم کئے جیسے معمولی آدمیوں میں بے تکلفی کے تعلقات ہوا کرتے ہیں۔

سلا نے کو روم سے ایک شخص نامی پمپی کو جو بعد میں پمپی اعظم کے نام سے مشہور ہوا ایسا بڑھایا تھا اور پھر اس کی ایسی حالت ہو گئی تھی کہ وہ سلا کی بھی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا تھا۔ کیونکہ جب پمپی نے اپنے ایک دوست کے لئے قونسلی کی جگہ سلا کی مرضی کے خلاف منظور کرائی تو اس پر سلا نے دھمکی دیکر اسے مرعوب کرنا چاہا پمپی کو غصہ آگیا اور یہ کہکر خاموش رہنے کے لئے کہا کہ "آدمی زیادہ تر سورج کو نکلتے وقت پوجا کرتے ہیں نہ کہ ڈوبتے وقت"۔ قیصر (جولیس) کیساتھ ایک شخص بروٹس نے ایسی خصوصیت حاصل کر لی تھی کہ قیصر نے وصیت نامہ میں لکھدیا تھا کہ اس کے (قیصر کے) بھتیجے کے بعد (بروٹس) وارث تخت وتاج ہو۔ اور یہ ہی (بروٹس) وہ شخص تھا جس نے اسے (قیصر کو) قتل کرایا۔ جب قیصر ایک شگون بد کی وجہ سے خصوصاً اس سبب سے

کہ اس کی ملکہ (کلپرنیا) نے متوحش خواب دیکھا تھا، مجلس سینیٹ کو برخاست کرنا چاہتا تھا تو اسی شخص نے اُس کا آہستہ سے ہاتھ پکڑ کر اُسکو کرسی پر سے یہ کہکر اٹھا دیا کہ جب تک بیگم صاحبہ کوئی اچھا خواب نہ دیکھ لیں اس وقت تک آپ مجلس کو برخاست نہ کریں۔ اس کا اثر قیصر پر بیحد تھا کیونکہ اینٹونیس نے سسرون کو ایک خط لکھا تھا اس میں یہ عبارت بلفظہ منقول ہے کہ "بروٹس ساحر تھا یعنی قیصر کو مسحور کر دیا تھا"۔ آگسٹس نے ایک شخص نامی (اگریپا) کو جس کا درحقیقت حسب نسب اچھا نہ تھا بہت بڑھا دیا تھا۔ جب آگسٹس نے میکناس (وزیر) سے اپنی لڑکی جولیا کی شادی کے متعلق مشورہ کیا تو میکناس کو کہنا پڑا کہ "آپ یا تو اپنی لڑکی کی شادی (اگریپا) سے کر دیں یا اسکو (اگریپا کو) قتل کر دیں۔ ان دونوں طریقوں کے سوائے اور کوئی راہ مفر نہیں ہے۔ آپ ہی نے اس کو آخر ایسا عروج دیا تھا"۔ قیصر (طربولس) کے ساتھ ایک شخص مسمّی سیجانس کے ایسے روابط ہو گئے تھے کہ دونوں ایک روح دو قالب سمجھے اور کہے جاتے تھے۔ قیصر طربولس نے ایک خط میں اس کو لکھا ہے کہ "میں نے بلحاظ ایک دوست کے فلاں باتیں تم سے پوشیدہ

نہیں رکھیں"۔ اور ان دونوں کی دوستی کی صداقت کی بنا پر مجلس سینیٹ نے " دوستی " کی ایک قربان گاہ بنائی تھی اور یہ قربان گاہ ایسی تھی جیسے کسی " دیبی " کی قربان گاہ ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح یا اس سے بھی بڑھا ہوا دوستی کا تعلق (سیوبرس) اور (پلینٹیس) میں تھا۔ سیوبرس نے اپنے لڑکے کو مجبور کر کے پلینٹیس کی لڑکی سے شادی کرادی تھی۔ جب پلینٹیس کسی معاملہ میں سیوبرس کے لڑکے کو خفیف کیا کرتا تھا تو اس تھتک میں اس کا باپ بھی (پلینٹیس کا) معاون ہوجایا کرتا تھا، اور اس نے مجلس سینیٹ کو جو خط لکھا تھا اس میں پلینٹیس کے متعلق یہانتک لکھدیا تھا کہ " اس شخص کو (پلینٹیس کو) میں اسقدر چاہتا ہوں کہ میں مرجاؤں اور یہ زندہ رہے"۔ پس اگر یہ سلاطین طراجن یا فیلقیس کے جیسے ہوتے تو یہ خیال ہوسکتا تھا کہ یہ بات ان کی نیک طینتی سے پیدا ہوئی تھی مگر چونکہ یہ سب بادشاہ نہایت دانشمند، نہایت قوی ارادہ، نہایت صاحب فہم اور نہایت دور اندیش تھے لہذا ان باتوں سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ باوجودیکہ ان کو تمام عیش و عشرت کے سامان جو انسان فانی کو حاصل ہوسکتے ہیں، حاصل تھے، مگر ان تمام

چیز وں کی وقعت ان کی نظر میں ایک دوست کے مقابلہ میں مطلق نہ تھی اور علاوہ اسکے ایک بات اور غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ یہ لوگ بادشاہ تھے، صاحب تعلقات تھے، انکے بڑی بڑی جاگیریں تھیں مگر پھر بھی اُن کو ان متعلقین سے دوستی کا لطف میسر نہ آ سکا۔

وہ بات کبھی نہ بھولنی چاہیئے جو (کومینوس) نے اپنے پہلے آقا (چارلس یازدہم) کے متعلق بیان کی ہے یعنی یہ کہ وہ اپنے رازوں کو کبھی سے نہ کہتا تھا اور خاص کر اُن امور کو جن سے اس کو نہایت تشویش ہوتی تھی۔ (کومینوس) آگے چل کر بیان کرتا ہے کہ اُس کی اس روش نے اس کی آخری عمر میں اس کی سمجھ میں فتور ڈالدیا تھا اور آخر کار اسکی عقل جاتی رہی تھی۔ (کومینوس) اگر چاہتا تو حقیقت میں یہ ہی فیصلہ اپنے دوسرے آقا (لوئس یازدہم) کے متعلق بھی کرسکتا تھا جس کے لئے یہ ہی روش (یعنی سکوت) محض باعث اذیت تھی۔ (حکیم فیثاغورث) کی مثال ایک لایعنی سی ہے مگر سچ ہے کہ "دل کو نکھاؤ" حقیقت میں اگر کوئی شخص اس بات کو سخت الفاظ میں بیان کرنا چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ جو لوگ ایسے دوست نہیں رکھتے جن سے وہ اپنے

دل کی باتیں بے تکلف کہہ سکیں تو وہ مردم خور ہیں یعنی اپنا دل خود کھاتے ہیں۔ مگر سب سے زیادہ قابل غور یہ بات ہے جس کو بیان کرکے میں دوستی کے پہلے فائدے کے ذکر کو ختم کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ دوست سے دل کھول کر باتیں کرنے سے ہر شخص پر دو متضاد اثر ہوا کرتے ہیں، ایک یہ کہ اسکی خوشیاں اور شادمانیاں دوچند ہو جاتی ہیں اور دوسرے یہ کہ اس کے غموں میں تخفیف ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے کہ ایسا کوئی شخص نہیں ہے کہ جو اپنی خوشیوں کا ذکر اپنے دوست سے کرے اور اسکی خوشیوں میں اضافہ نہ ہو جائے یا اپنے دوست سے غم کا ذکر کرے اور اس کا غم گھٹ نہ جائے۔ پس اس کا اثر دل پر ایسا ہوتا ہے جیسا بقول شخصے اکسیر کا کہ وہ (اکسیر) متضاد و مختلف اثر پیدا کرتی ہے مگر سب مزاج کے موافق ہوتے ہیں۔ بلکہ اگر ہم اس قول سے مدد نہ بھی لیں تو اس کی نظیر ہماری فطرت میں موجود ہے۔ کیونکہ ہمارے جسموں میں اعضاء کے اتحاد عمل سے ہر ایک فعل طبیعی قوی اور لطیف ہو جاتا ہے اور برعکس اس کے یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ کسی پر زور اثر کو خفیف و ضعیف بھی کر دیتا ہے اور یہی حال نفوس کا بھی ہے۔

دوسرا نفع جو دوستی سے برآمد ہوتا ہے وہ ذہن کیلئے نہایت مفید اور قابلِ وقعت ہے جیسا کہ پہلا نفس کے لئے ہے۔ اس لئے کہ اگر دوستی ایک طرف تحریکات کے طوفان کو دفع کرکے نفس کو سکون و اطمینان بخشتی ہے تو دوسری طرف خیالات کی تاریکی اور الجھنوں کو ذہن سے دور کرکے اس کو علم کی روشنی سے بہرہ مند کرتی ہے یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ یہ باتیں صرف دوست کے مخلصانہ مشورے سے ہی نصیب ہوتی ہیں۔ بلکہ اس کے لئے یہ سمجھنا چاہئے کہ بغیر دوست کے مشورے کے بھی انسان کا ذہن گوناگوں خیالات کا مرکز ہوتا ہے، اور دوسروں کے ساتھ تبادلۂ خیالات اور بحث و تمحیص سے اس کا ذہن وسیع اور اس کی سمجھ اچھی ہو جاتی ہے۔ پھر وہ بلند خیال ہو جاتا ہے اور اس کے خیالات باترتیب اور سلجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کی تحریر و تقریر کیسی مرصع اور جامع ہوتی ہے۔ آخر کار اس کا ذہن بہت قوی ہو جاتا ہے ذراسی دیر میں اس کا خیال ایسی جگہ پہنچتا ہے کہ دوسروں کو یہ بات مدتوں میں بھی نصیب نہیں ہو سکتی۔ (ذمسطوکلیز) نے شاہِ فارس سے کیا اچھی بات کہی تھی کہ بات چیت (گفتگو) منقش تجر کے تھان کی مانند

ہوتی ہے یعنی جب تھان کی تہ کھولی جاتی ہے اس وقت اس کے بیل بوٹوں کی بہار نمایاں ہوتی ہے۔ خیالات کا بھی یہی حال ہے۔ جبتک اُن پر غور نہ کیا جائے ان کا حال کپڑے کے لپٹے ہوئے تھان کا سا ہے۔ دوستی سے جو دوسرا نفع مترتب ہوتا ہے اس کا انحصار صرف اس پر ہی نہیں ہے کہ وہ کسی ایسے دوست سے صلاح لیا کرے جس میں مشورہ دینے کی صلاحیت ہو۔ اگرچہ ایسا ہو تو بہتر ہے بلکہ بغیر اس کے بھی انسان خود اپنی بات سمجھتا ہے اور اپنے خیالات کو صاف کرتا رہتا ہے اور اپنے ذہن کو سان پر جو خود کاٹ نہیں سکتی لگا کر تیز کر لیتا ہے۔ حاصل کلام آدمی کو چاہیئے کہ وہ خود کسی مورت یا تصویر ہی سے باتیں کیا کرے اور اپنے خیالات کو کند نہ ہونے دے۔

اب دوستی کے دوسرے نتیجہ کی تکمیل کے لئے اس میں ایک اور بات کا اضافہ کر دینا چاہیئے جو بہت ہی واضح ہے اور جو ہر کس و ناکس کے تجربہ میں آتی رہتی ہے وہ یہ ہے کہ دوست کا خلوص سے مشورہ دینا۔ ہرالکیٹس نے کیا خوب کہا ہے کہ "آزادانہ مشورہ ہمیشہ اچھا ہوتا ہے"۔ اور یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ دوسروں سے مشورہ لیکر انسان

جو راستہ قایم کرتا ہے وہ اس راستے سے بہت اچھی اور یقینی طور پر ہوتی ہے کیونکہ وہ خود اپنی سمجھ اور اپنے فیصلے سے قایم کرتا ہے اور یہ بات ہمیشہ ہے۔ انسان کی ذات میں بیشتر خامیاں موجود ہیں حتیٰ کہ دوست کے مشورہ میں اور اس راستے میں جو انسان خود قایم کرتا ہے اتنا فرق ہوتا ہے جتنا کہ کسی دوست کی رائے میں اور ایک خوشامدی کی رائے میں۔ اس وجہ سے کہ انسان کے نفس سے زیادہ خوشامدی اور کوئی چیز نہیں ہے۔ اور اپنے نفس کی خوشامد کا علاج مخلص دوست کے آزادانہ مشورے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ مشورہ دو اقسام پر مشتمل ہے ایک اخلاق کے متعلق اور دوسرا کاروبار کے بارے میں۔ پہلا مخلص دوست کا مشورہ نفس کی صحت کا محافظ ہوتا ہے۔ آدمی کا اپنے نفس سے سخت محاسبہ کرتے رہنا ایک قسم کی دوا ہے جو بعض وقت بہت ناگوار و تلخ معلوم ہوتی ہے۔ اخلاقیات کی اچھی کتابوں کا پڑھنا موثر اور کارگر نہیں ہوتا۔ دوسروں میں اپنی خامیوں اور عیوب کا ڈھونڈنا بعض اوقات اپنے حال کے مناسب نہیں۔ مگر سب سے بہتر رائے عمل پیرا ہونے کیلئے اور نہایت عمدہ علاج سچے دوست کا مخلصانہ

مشورہ ہے۔ یہ عجیب بات دیکھنے میں آئی ہے کہ کیسی کیسی فاحش غلطیاں اور حد درجہ کی بیہودگیاں لوگوں سے خصوصاً بڑے بڑے آدمیوں سے سرزد ہوتی رہتی ہیں جس سے ان کی بدنامی بھی ہے اور نقصان بھی۔ یہ سب اس لئے ہوتا ہے کہ ان کا کوئی دوست نہیں ہوتا جو ان باتوں سے آگاہ کر دیا کرے۔ (سینٹ جیمس) ایسے ہی لوگوں کے متعلق کہتا ہے کہ "یہ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کبھی کبھی آئینہ دیکھ لیتے ہیں مگر فوراً اپنی شکل و شمائل کو بھول جاتے ہیں"۔ کسی کاروبار کے لئے مشورہ لینے کے متعلق اگر کوئی شخص چاہے تو یہ کہہ سکتا ہے کہ جتنا دو آنکھوں سے دیکھتا ہے اتنا ہی ایک آنکھ سے دیکھ سکتا ہے۔ یا یہ کہ کھیلنے والے کو دیکھنے والے سے زیادہ چال سوجھتی ہے یا ایک شخص جو غصے کی حالت میں ہو اسکی اتنی سمجھ ہوتی ہے جتنی اس شخص کی جو حالت اطمینان میں متانت سے بیٹھا ہوا ہو یا یہ کہ بندوق جیسے چھاتی پر نشانہ باندھ کے چلائی جاسکتی ہے ویسے ہی ٹکٹکی پر سے چل سکتی ہے۔ اس کے متعلق اسی قسم کی باتیں جن میں اس کا ذہن دوڑ سکے اور بھی کہہ سکتا ہے جو کچھ بھی ہو مشورہ لینا بہتر ہی ہے جس سے کاروبار خوش اسلوبی سے انجام پاتا ہے۔ میری اس

تحریک کی بنا پر اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ وہ مشورہ لیا تو کرے گا مگر ٹکڑے ٹکڑے کرکے یعنی کسی کام کے ایک حصّے کے متعلق ایک آدمی سے رائے لے اور دوسرے حصے کے بارے میں دوسرے شخص سے مشورہ لے۔ پس بہتر تو یہ ہے یعنی اس قسم کی رائے سے بہتر ہے کہ وہ قطعی کسی سے مشورہ نہ لے۔ اس وجہ سے کہ اس میں دو خطرے ہیں ایک یہ کہ اسکو کوئی سچا مشورہ نہ دے گا کیونکہ سچا مشورہ بہت نادر ہوتا ہے سچا مشورہ اگر کوئی دے تو اس کو مخلص دوست ہونا چاہیئے اور اس مشورہ میں رائے دینے والے کی کوئی غرض اور کوئی مطلب پوشیدہ نہ ہونا چاہیئے۔ دوسرا خطرہ یہ ہے کہ اگرچہ اس نے یہ مشورہ نیک نیتی ہی سے کیوں نہ دیا ہو مضر ہوگا اور خالی از قباحت نہ ہوگا اس وجہ سے کہ اس میں ایک قسم کا فائدہ اور ایک طرح کا ضرر پوشیدہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر تم کسی طبیب کو بلاؤ جو اس مرض کے علاج کا ماہر ہو جسکی تم کو شکایت ہے مگر خود تمھارے مزاج سے ناواقف ہو۔ یہ سچ ہے کہ وہ تمھارے مرض کے رفع کرنیکی تدبیر تو کرے گا مگر تمھارے مزاج سے ناواقفیت کی بنا پر کسی اور طرح سے تمھاری طبیعت کو بگاڑ دیگا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ مرض تو جاتا رہے گا

مگر مریض راہی ملک عدم ہوگا۔ مگر ایک دوست جو تمھارے حالات سے بخوبی واقف ہو وہ کسی بات میں مشورہ دیتے وقت اس بات کا خیال رکھے گا کہ تمھارے دوسرے امر میں کسی قسم کا نقصان نہ ہو۔ پس تم کو چاہیے کہ ایرے غیرے کے مشوروں پر بھروسہ نہ کرو۔ اس قسم کے مشورے تم کو یقین اور ہدایت سے زیادہ شکوک اور گمراہی میں مبتلا کردیں گے۔

دوستی سے جو دو سود مند نتائج مترتب ہوتے ہیں یعنی ایک سے طبیعت میں سکون و اطمینان نصیب ہوتا ہے اور دوسرے رائے میں صواب۔ ان دونوں کو ذکر ختم کرنے کے بعد اب دوستی کے ایسے نتیجے کے متعلق غور کیا جائے گا جو سب سے اخیر ہے اور اسکو انار سے تشبیہ دے سکتے ہیں جس میں بہت سے دانے ہوتے ہیں اور جو ایک دوسرے کے ہر حال میں شریک و معین رہتے ہیں۔ اس بات کے دریافت کرنے کا کہ دوستی سے دنیا میں کیا کیا کام نکلتے ہیں بہترین طریقہ یہ ہے کہ اگر اسکے متعلق غور کیا جائے کہ کتنے امور ایسے ہیں جن کو انسان خود انجام نہیں دیسکتا تو معلوم ہو جائے گا کہ قدما کا یہ مقولہ غلط ہے کہ " انسان کا دوست اسکی دوسری

ہستی ہوتی ہے (یعنی ایک روح دو قالب ہوتے ہیں مترجم) اس وجہ سے کہ دوست اپنے سے زیادہ ہوتا ہے"۔ موت کا وقت مقررہ ہے مگر لوگ ایسی چیزوں کے لیے جن کو وہ دل سے چاہتے ہیں، ایک مرتبہ نہیں سینکڑوں مرتبہ مرتے رہتے ہیں، شلاً: بنی اولاد کو کسی کام سے لگانا یا کسی کام کو انجام دینا اور اسی طرح بہت سے کاموں کے لئے اگر کسی آدمی کا کوئی دوست صادق ہو تو اُسے اس بات کا اطمینان تو رہتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد بھی ان امور کی دیکھ بھال جس سے اُسے دلچسپی ہو اس کے دوست کے ذریعہ سے جاری رہیگی۔ پس اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے ارادوں کو پورا کرنے کیلئے دو زندگیاں ہوتی ہیں۔ آدمی کا ایک جسم ہوتا ہے اور وہ ایک ہی جگہ محدود رہتا ہے مگر جب وہ رشتہ دوستی میں منسلک ہوجاتا ہے تو اس کے تمام کام گویا خود اس سے اور اس کے مددگار (یعنی دوست) سے متعلق ہوجاتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ وہ اپنے کام دوست سے کراسکتا ہے۔ ایسے کتنے امور ہیں جن کو انسان بغیر اپنی کسی قسم کی بیحرمتی کے کرسکتا ہے یا خوش اسلوبی سے خود انجام دے سکتا ہے؟ کسی موقع پر اپنی تعریف

کرنا تو در کنار انسان شرم کی وجہ سے اپنی لیاقت کا اظہار بھی نہیں کرسکتا۔ یعنی بعض وقت انسان اپنی حاجت کا اظہار، دست سوال دراز کرنے کو بھی گوارا نہیں کرسکتا۔ اسی طرح بہت سے ایسے اور امور بھی ہیں۔ یہ سب باتیں دوست کے منھ سے بھلی معلوم ہوتی ہیں گو خود کی زبان سے بری معلوم ہوتی ہوں۔ پھر اسی طرح خود انسان کے بہت سے جائز تعلقات ہوتے ہیں جن کو وہ کسی عنوان ترک نہیں کرسکتا۔ ایک شخص اپنے بیٹے سے گفتگو کرسکتا ہے مگر باپ کی حیثیت سے۔ ایک شخص اپنی بیوی سے صرف شوہر کی حیثیت سے گفتگو کرسکتا ہے۔ ایک تیسرا شخص اپنے دشمن سے گفتگو کرسکتا ہے مگر کچھ شرائط کے ساتھ مگر دوست ان شرائط سے مستغنیٰ ہے اور ہر حال میں حسب موقع گفتگو کرسکتا ہے۔ پس دوست کے کاموں کی انتہا نہیں ہے۔ میں تو اسکے لئے یہ قاعدہ ہی مقرر کئے دیتا ہوں کہ جو انسان دوستی کے تعلقات سے وابستہ نہیں ہے اور دنیا کے اسٹیج پر خود کوئی کام بھی نہیں کرسکتا تو اس صورت میں اسکو دنیا ہی سے رخصت ہو جانا چاہئے۔ فقط

خرچ

از لارڈ بیکن

دولت خرچ کرنے کے لئے ہوتی ہے اور اس کا مصرف عزت و حرمت اور اچھے کاموں کے واسطے ہوتا ہے۔ اس لئے موقع کے لحاظ سے غیر معمولی اخراجات کو ضرور محدود کر دینا چاہیے کیونکہ جس طرح آدمی آخرت میں جزائے خیر ملنے کی امید پر دریا دلی سے خرچ کر ڈالتے ہیں اسی طرح انھیں ملک کی خاطر بھی صرف کرنا چاہیے۔ لیکن روزمرہ کے اخراجات اصل پونجی کے لحاظ سے ہونا چاہئیں اور ان اخراجات پر اتنا قابو ہونا چاہیئے کہ حد سے تجاوز نہ کر سکیں۔ یہ اخراجات ملازمین کی فریب دہی اور بدمعاملگی کے تابع نہ ہونا چاہئیں۔ اس خوش اسلوبی سے ان کا مصرف ہونا

چاہیئے کہ اندازہ کے مطابق سب کاموں پر پورا پورا بیٹھے اور لوگوں کی نگاہوں میں جنچے ۔حقیقت میں اگر کوئی شخص بغیر کمی وبیشی کے اخراجات کا ڈھنگ یکساں رکھے تو اس کے معمولی اخراجات اس کی آمدنی کے نصف ہونگے اور اگر وہ مالدار بننا چاہتا ہے تو اس کی آمدنی کا تیسرا حصّہ خرچ کرنا چاہیئے اپنے کاروبار کی خود دیکھ بھال کرتے رہنا' یہ بات بڑے سے بڑے آدمی کے لئے بھی ہتک کا باعث نہیں ہے ۔بعض لوگ ایسا نہیں کرتے صرف لاپروائی کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ اس شبہ سے متاثر ہو کر کہ اگر وہ اپنی جائداد کو شکستہ حالت میں دیکھیں گے تو اُن کو رنج ہوگا۔لیکن حق بات تو یہ ہے کہ زخم بغیر امتحان کے اچھا نہیں ہو سکتا ۔جو شخص اپنے کاروبار کی قطعی نگرانی نہیں کر سکتا تو اس کو ان دو باتوں پر عمل کرنا چاہیئے' ایک یہ کہ نوکروں کو دیکھ بھال کے رکھے اور دوسرے یہ کہ ان کو اکثر بدلتا رہے اس وجہ سے کہ نئے ملازم پہلے پہل محتاط ہوا کرتے ہیں اور فریب دہی میں کم حصہ لیا کرتے ہیں ۔جو شخص اپنے کاروبار کو کبھی دیکھ سکے تو اس کو چاہیئے کہ اس وقت خوب تحقیق اور چھان بین سے کام لے۔ اگر کسی کام میں زیادہ صرف ہو جائے تو اس کے لئے لازمی ہے کہ اس کی

کسر دوسرے کام میں نکال لے۔ اگر اس کا خرچ کھانے پینے میں ہو جائے تو اس کو چاہئے کہ کپڑوں میں اس کی کسر پوری کرے۔ اگر آرائش کے کام میں زیادہ صرف ہو گیا ہے تو اس کو چاہئے کہ اس کمی کو اصطبل کے خرچ سے پورا کرے۔ الغرض اسی طرح جس کام میں جتنا صرف ہو جائے اس کی کسر دوسرے کام میں نکال لیا کرے۔ اس وجہ سے کہ جو شخص تمام کاموں میں بلا سوچے سمجھے خرچ کرتا ہے وہ تباہی سے کسی صورت میں بھی نہیں بچ سکتا۔ کوئی شخص اپنی جائداد کو عجلت میں فروخت کرنا چاہے تو اس کو ایسا ہی نقصان ہو سکتا ہے جس طرح اس کو بہت عرصہ میں فروخت کرنے سے ہوتا۔ اس وجہ سے کہ کبھی چیز کا عجلت میں فروخت کرنا عموماً نفع و نقصان سے خالی نہیں ہوتا۔ علاوہ اس کے جو شخص نہایت عجلت میں اپنی جائداد کو فروخت کرتا ہے وہ اپنی پہلی حالت پر آجائیگا اس وجہ سے کہ جب وہ ان مشکلات سے نجات پالے گا تو پھر اپنی پہلے جیسی روش اختیار کرلے گا۔ جو شخص اپنی جائداد کو رفتہ رفتہ فروخت کرتا ہے، اس سے کفایت شعاری کی عادت پیدا ہوتی ہے اور یہ عادت اس کے دماغ پر بھی ایسا اثر ڈالتی ہے جیسا اس کی جائداد پر

جب شخص کو اپنی جائداد میں اصلاح کی درحقیقت ضرورت ہے اُسکو چاہیئے کہ معمولی معمولی چیزوں سے بھی متنفر نہ ہو اور اس کو عموماً یہ بھی مدنظر رکھنا چاہیئے کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کی آمدنی کو بڑھانے کی بہ نسبت چھوٹے چھوٹے اخراجات میں تخفیف کر دینا باعث توہین ہے مگر کم۔ آدمی کو چاہیئے کہ ایسے روزمرہ کے اخراجات میں اضافہ کرتے وقت بہت احتیاط سے کام لے لیکن ایسے اخراجات جو عود کرنے والے نہیں ہوتے ان میں وہ دل کے ارمان نکال سکتا ہے۔ فقط



تحفہ

از مسٹر ایمرسن

کہا جاتا ہے کہ دنیا حالتِ دیوالیہ میں ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دنیا اس سے زیادہ دنیا کی زیر بار ہے جتنا وہ ادا کر سکتی ہے اور ایسی حالت میں عدالت سے اس پر ڈگری ہو سکتی ہے اور فروخت کی جا سکتی ہے۔ وہ مشکل جو کرسمس اور نوروز میں یا دیگر اوقات میں تحفہ تحائف بھیجنے میں پیش آیا کرتی ہے' میں اس مشکل کو عام افلاس کی وجہ نہیں سمجھتا جس میں کسی نہ کسی صورت سے ہر کس و ناکس مبتلا ہے اس وجہ سے کہ فیاض ہونا نہایت مسرت کا باعث ہوتا ہے' اگرچہ قرضے کے ادا کرنے میں تکلیف ضرور ہوتی ہے۔ لیکن ان دونوں باتوں میں سے کسی کے انتخاب کرتے وقت دقتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اگر کبھی میں

خیال کروں کہ مجھے کسی شخص کو فلاں تحفہ پیش کرنا ہے تو یہ سوچتے سوچتے
میں پریشان ہوجاتا ہوں کہ کونسی چیز تحفے میں پیش کروں تا آنکہ تحفہ
پیش کرنے کا موقع نکل جاتا ہے۔ پھول اور پھل و غیرہ ہمیشہ موزوں
تحفے ہیں، پھول اس وجہ سے کہ اس سے تجربہ کے طور پر یہ ثابت ہوتا ہے
کہ خوبصورتی کی صرف ایک جھلک کا دنیا کی تمام کارآمد چیزوں سے پلہ
بھاری رہتا ہے۔ یہ ونقریب ملکوتات گو نہ معمولی کیفیات کے صعب و
سخت حالت کے متضاد معلوم ہوتے ہیں، وہ ایسے ہیں جیسے کسی کارخانہ
میں موسیقی کی آواز۔ نیچر ہم سے پیار دلار سے کام نہیں لیتی، ہماری
حیثیت بچوں کی سی ہے، ہم اس کے دلارے نہیں ہیں۔ اور حق
تو یہ ہے کہ وہ اس کی شایق بھی نہیں ہے۔ ہمارے ساتھ ہر ایک معاملہ
میں شدید عالم گیر قوانین کے بموجب بلا خوف و رعایت برتاؤ کیا جاتا
ہے۔ پھر بھی یہ نازک پھول حسن و محبت کی ناز و نیاز کی مانند معلوم ہوتے
ہیں۔ لوگ ہم سے کہا کرتے ہیں کہ ہم، خوشامد کو پسند کرتے خواہ ہم اُس
کے دامِ تزویر میں نہ پھنسیں کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم میں اس
بات کی کافی قابلیت موجود ہے کہ ہماری خاطر و خوشامد کیجائے پھولوں

سے بھی ہمیں اسی قسم کی کچھ خوشی حاصل ہوتی ہے۔ آخر میری کیا حقیقت ہے جو ایسے خوشگوار اشارات سے مجھے مخاطب کیا جائے؟ پھل قابل قبول تحفے ہیں اس وجہ سے کہ وہ تجارت کی جان ہیں اور وہ اس قابل ہیں کہ ہم اُن کی انتہائی قدر و قیمت سمجھیں۔ اگر کوئی شخص مجھے بُلائے اور میں سو میل کی مسافت طے کرکے اُس کے پاس پہنچوں اور وہ میرے سامنے موسم گرما کے عمدہ پھلوں کا ایک ٹوکرہ رکھدے تو اس وقت مجھ سے سفر کی تکلیف کا احساس بہت کچھ رفع ہو جائیگا۔

معمولی تحفہ تحایف پیش کرنے کے لئے ضرورت ہر روز موزونیت وخوبی پیدا کر دیا کرتی ہے اور ایک شخص اس بات سے خوش ہوتا ہی کہ اُس کے لئے ایک خاص ضرورت کے اعتبار سے کوئی اور چارہ کار باقی نہیں رہا، کیونکہ جو شخص تمھارے دروازے پر کھڑا ہوا ہے اور اس کے پاس جوتہ نہ ہو تو اس صورت میں تمھیں اس بات کے خیال کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اُسے کوئی بیش قیمت چیز دیدینا چاہیئے اور جس طرح کسی آدمی کو روٹی کھاتے اور پانی پیتے دیکھکر خوشی ہوتی ہی خواہ وہ گھر میں ہو یا باہر ہو، اسی طرح ان ضروریاتِ اوّلین کو رفع

کرنے سے بھی پیشتر نہایت ضروری ہوا کرتی ہے۔ ضرورت ہر چیز کو جس طرح انجام دیتی ہے۔ یہ ایک قابل قدر معلوم ہوتی ہے کہ جب کسی کی ایسی حالت ہو کہ وہ اپنی ضرورت کا سہارا کسی اور کو سمجھے تو اس وقت بہتر ہے کہ حاجتمند کی مرضی پر اس کی ضرورت کا فیصلہ چھوڑ دیا جائے اور اس کی طلب پر اس کو سب کچھ دیدیا جائے، خواہ اس وقت دینے والے کو اپنی طبیعت پر کتنا ہی جبر کیوں نہ کرنا پڑے۔ اگر اسکی خواہش وہمی یا قیاسی ہو تو اس کی سزا دہی کا کام دوسروں پر چھوڑ دینا چاہیے۔ انتقام کش دیوتاؤں کا کام کرنے کی بجائے میں اور بہت سے دوسرے کام سوچ سکتا ہوں۔ ضرورت کی چیزوں کے بعد دوسری چیزوں کے لئے تحفہ تحائف پیش کرنے کا قاعدہ جو میرے ایک دوست نے مقرر کیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر ہم کسی کو کوئی تحفہ پیش کرنا چاہیں تو ایسا تحفہ پیش کرنا چاہیے جو اس کے رویّہ کے مطابق ہو اور اس کے خیالات سے بھی آسانی سے مطابقت کر سکے۔ لیکن ہماری صاحب سلامت اور اظہارِ محبت کی علامت بیشتر وحشیانہ ہوا کرتی ہیں۔ انگوٹھیاں اور ہیرے جواہرات تحفہ تحائف میں شمار ہونے کے قابل نہیں ہیں بلکہ

یہ تحفہ تحائف کی معذرتیں ہیں۔ تحفہ صرف وہی ہے جو خود تمھاری ذات
کا جزو ہو۔ تجھے میرے لئے اپنا خون بہانا چاہیئے۔ اسی لئے شاعر اپنی
نظمیں پیش کرتا ہے۔ گڈریہ اس کی بھیڑیں، کسان غلہ، کان کن
جواہر، جہازران مونگا اور سیپ، مصور تصویر، لڑکی خود اپنے ہاتھ
کا کاڑھا ہوا رومال۔ یہ طریقہ صحیح بھی ہے اور مرغوب بھی۔ اس وجہ
سے کہ یہ سوسائٹی کی ابتدائی بناؤں کو کسی صورت میں درست
کر دیتا ہے جبکہ کسی شخص کے تحفے سے اس کی سوانح پر روشنی پڑتی
ہے اور ہر شخص کی دولت سے اس کی قابلیت کا ثبوت ملتا ہے لیکن
یہ بالکل بیکار و بے کیف بات ہے کہ تم بازار سے میرے لئے ایسی چیزیں
خریدنے کیلئے جاؤ جن سے تمھاری زندگی و قابلیت کا اظہار نہ ہوتا ہو،
بلکہ ان سے کسی سنار کی قابلیت کا اظہار ہوتا ہو۔ یہ بات بادشاہوں
اور دولتمندوں کے لئے موزوں ہے جو بادشاہوں اور ملک کی حالت
فاسد کی نمائندگی کرتی ہے کہ وہ سونے چاندی کے سامان پیش کریں
گویا یہ ایک نمایاں نذر گناہ یا ادائی تاوان ہے۔
فوائد کا قانون بہت بے ڈھنگا بحری راستہ ہے جس میں ہوشیاری

سے کشتی چلانے کی ضرورت ہے یا اس راستے سے گزرنے کیلئے مضبوط کشتیوں کی ضرورت ہے۔ انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ تحفہ تحائف وصول کیا کرے۔ آخر تمھیں تحائف پیش کرنے کی جراٴت کیونکر ہوتی ہے؟ تمھیں خود اپنی مدد کرنی چاہیئے۔ جو شخص ہمیں کوئی چیز دیتا ہے وہ ہمارا مجرم ہے۔ ہم جس ہاتھ سے لیتے ہیں وہ بھی کسی قدر معرض خطر میں رہتا ہے۔ کوئی شخص اگر ہمیں کوئی چیز محبت سے دے تو اُس کو ہمیں لے لینا چاہیئے، اس وجہ سے کہ اسی طریقے سے ہم خود اپنی ذات سے کبھی چیزیں وصول کیا کرتے ہیں۔ لیکن اس شخص سے کوئی چیز نہ لینا چاہیئے جو کچھ احسان رکھ کر دے۔ بعض وقت ہم گوشت سے بھی جو ہم کھاتے ہیں نفرت کرنے لگتے ہیں کیونکہ اس سے بھی کسی حد تک ہمارا احتیاج ظاہر ہوتا ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ ہماری تمام ضرورتیں پوری ہوں۔ اس سے کم کوئی چیز ہمارے لئے باعث اطمینان قلب نہیں ہو سکتی۔ یہاں تک کہ اگر مٹی، آگ، پانی، موقع، محبت، عزت اور مسرت کے اسباب کے علاوہ اور باتیں ہمیں میسر نہ ہوں تو اس صورت میں ہم سوسائٹی کو قابل نفرت تصور کیا کرتے ہیں۔

جو شخص تحائف کو خوش اسلوبی سے نہ لے سکے وہ اچھا آدمی ہے۔ ہم کسی تحفہ کو وصول کرتے وقت یا تو خوش ہوا کرتے ہیں یا ناخوش۔ مگر یہ دونوں باتیں نازیبا ہیں۔ جب میں کوئی تحفہ وصول کرتے وقت خوش ہوتا ہوں تو مجھے خیال ہوتا ہے کہ میں اپنے اوپر خود کچھ زیادتی کر رہا ہوں اور جب رنجیدہ ہوتا ہوں تو مجھے اپنی گری ہوئی حالت کا احساس ہوتا ہے۔ چنانچہ جب میری آزادی پر حملہ کیا جاتا ہے تو اس وقت مجھے افسوس ہوتا ہے یا یہ کہ جب کوئی ایسا شخص میرے پاس کوئی چیز تحفۃً بھیجے جو میرے صحیح منشا کو نہیں جانتا تو اس وقت بھی مجھے افسوس ہوتا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ وہ اصل فعل کا سودا نہیں ہے اور اسی طرح اگر اس کے تحفے سے مجھے بیحد خوشی ہوتی ہے تو اس وقت مجھے شرمندہ ہونا چاہیئے اس لئے کہ تحفہ بھیجنے والا اگر میرے دل کا بھید پائے تو اُسے معلوم ہو جائے گا کہ مجھے اس کے تحفے سے محبت ہے اُس سے نہیں ہے۔ وہ عطیہ سچ یہ ہے کہ عطیہ دینے والے کا اپنے آپ کو اسی حد تک مجھ میں جذب کر دینا ہے جس حد تک کہ میں نے اپنے تئیں معطی میں جذب کیا ہو۔ جب تعلقات میں مساوات ہوتی ہے اسی وقت تحفہ تحائف کے

تبادلہ میں لطف آتا ہے یعنی جو چیز میری ہوتی ہے وہ اس کی ہو جاتی ہے اور جو چیز اس کی ہوتی ہے وہ میری ہو جاتی ہے۔ پھر میں اس سے کہتا ہوں کہ جب یہ تمام چیزیں میری ہی ہیں تو پھر تم ان چیزوں کو مجھے کیسے دے سکتے ہو۔ اس کے یہ معنی ہونگے کہ گویا اس چیز کو دیکر تم میرے اس یقین کی (یعنے من تو شدم تو من شدی کی) تردید کرتے ہو۔ اسی لئے خود اپنی چیزوں کو تحفۃً دینا بہ نسبت کار آمد چیزوں کے تحفۃً دینے کے زیادہ موزوں ہے۔ مندرجہ ذیل عطیہ کی صورت حقیقت میں ایک غاصبانہ فعل ہو جاتا ہے۔ یعنی جب عطیہ سے مستفید ہونے والا شخص ناشکر گذار ہو جس طرح عموماً ہر ایسے شخص اپنے معطی سے ہوا کرتے ہیں اور عطیہ کی کوئی قدر و منزلت نہیں سمجھتے بلکہ ان کی نظر اس[ل] خزانہ پر ہوتی ہے جس میں

[ل] ۔ فرض کرو کہ زید ایک لاکھ روپیہ کا مالک ہے اور فارغ البالی سے زندگی بسر کر رہا ہے۔ بکر ایک غریب اور مفلس آدمی ہے چنانچہ بکر ضروریات زندگی سے مجبور ہو کر زید سے امداد کا طالب ہوتا ہے۔ زید اس کو پانچ روپیہ بطور امداد کے دیدیتا ہے۔ بکر اس کو تو لے تو لیتا ہے مگر دل میں برا بھلا کہتا جاتا ہے کہ کمبخت کے پاس اتنا روپیہ ہے مگر مجھے صرف پانچ روپیہ ہی دیئے لیکن چلا جاتا ہے مگر زید کا شکر گزار نہیں ہوتا۔ یہ واقعہ اگر زید کو معلوم ہو جائے تو اسے یقیناً غصہ آئیگا۔ مگر مسٹر ایمرسن کو اسوقت بکر سے ہمدردی ہے زید سے غصے کی انکو پروا نہیں ہے۔

ست وہ جبر انگیز دی گئی ہے۔ چنانچہ میں اس صورت میں عطیہ سے مستفید
ہونے والے شخص کا ہمدرد ہوں۔ حضرت عطی کے غصے کی مجھے پروا نہیں
[illegible] اس وجہ سے کہ کسی سے شکرگزاری کی امید رکھنا بیوقوفی ہے۔ اور
حقیقت میں جس شخص نے کسی شخص پر کوئی احسان کیا ہو اُس کے احسان
کی شکرگزاری کے عدم احساس سے محسن کو تکلیف نہیں پہنچتی ہے۔
کیسی خوش قسمتی ہے تم نے کوئی احسان کیا ہو اُسے اس احسان کی بنا پر
ادا ہونے سے بغیر کسی قسم کی رنجش اور تکلیف کے علیحدہ ہو جانا حقیقت میں
بڑی خوشی کی بات ہے۔ کسی نے اگر تم پر کوئی احسان کیا ہو تو اُس کا
احسان حقیقت میں تمہارے لئے دل کو مضطرب کرنے والا فعل ہوگا
اور جس شخص کا تم نے آڑے وقت میں کوئی کام نکالا ہے تو قدرتی طور
پر وہ یہ چاہتا ہے کہ تمہارے موہنہ پر ایک تھپیڑ [۵] رسید کرے۔ بدھ
مذہب میں ایک بڑی قابلِ وقعت بات یہ ہے جس کی میں بہت
عظمت کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ کبھی کسی کے شکرگزار نہیں ہوتے بلکہ

---

۵ - یہ بھی وہ ہی خیال ہے مگر اپنی نوعیت کے اعتبار سے تھوڑا سا پہلے خیال سے
بڑھا ہوا ہے جس کے متعلق پہلے نوٹ دیا جا چکا ہے۔

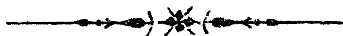
یہ بھی کہتے ہیں کہ "اپنے محسنوں کی خوشامد نہ کرو"۔

میرے خیال میں ان اختلافات کا سبب یہ ہے کہ آدمی میں اور کسی شخص میں کوئی یکسانیت نہیں ہے۔ اس وجہ سے کہ تم کسی بڑے آدمی کو کوئی چیز نہیں دے سکتے جب تم اس کے ملازمین کے زمرہ میں داخل ہو گئے تو وہ پھر تمہیں اپنی عظمت کا مقروض کر لیتا ہے۔ ایک شخص جو اپنے دوست کی خدمت کرتا ہے، تو یہ خدمت، اس خدمت کے مقابلے میں جو اسے معلوم ہے کہ اس کا دوست اس کیلئے انجام دینے کیواسطے تیار رکھتا، حقیر اور خودغرضانہ معلوم ہوتی ہے۔ دونوں موقعوں پر اپنے خدمت انجام دینے سے پہلے اور نیز بعد میں۔ اس ارادت کے مقابلے میں جو مجھے اس کے ساتھ ہے، وہ فائدہ جو میں اسے پہنچا سکتا ہوں نہایت حقیر معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے ہمارے کام خواہ وہ اچھے ہوں یا برے ایسے اتفاقی اور بے سوچے سمجھے ہوا کرتے ہیں کہ ہم شاذ و نادر ہی کسی شخص کو کسی کے عطیہ کا اعتراف یا شکریہ [illegible] کے لیے دیکھتے ہیں [illegible] اپنا کام [illegible] بلکہ ہمیں بعض اوقات کسی [illegible] سے کام نکالنے پر [illegible]

ہے۔ چنانچہ اسی طرح ہم کو شاذ ہی کوئی فائدہ بالراست نصیب ہوتا ہو یعنی یہ کہ اس میں کسی کا کوئی واسطہ اور وسیلہ نہ ہو۔ لیکن خلوص دل کا حال اس سے جداگانہ ہے یعنی یہ کہ خلوص کی برکتوں سے ہر کس و ناکس مستفید ہو کر اس کا شکر گزار ہوتا ہے اور اس کا ہمیں کوئی ذاتی علم بھی نہیں ہونے پاتا۔

میں سرکارِ محبت کی ذرا سی بھی مخالفت کرتے ہوئے ڈرتا ہوں اس وجہ سے کہ وہ تحائف کی جان و ایمان ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ وہ کسی قانون کی پابند بھی نہیں ہے۔ اگر محبت کی سرکار کسی کو کوئی سلطنت یا پھولوں کا گلدستہ بغیر کسی جانب داری کے بخشنا چاہتی ہے تو بخش دینے دو۔ بہت سی ایسی ہستیاں بھی ہیں جن سے ہم متوقع ہوتے ہیں کہ وہ ہم پر نگاہِ غلط انداز ڈالیں، ہمیں اس اُمید کو منقطع نہ کرنا چاہئیے اس وجہ سے کہ یہ انداز ان کا خاص حق ہے اور کسی مادی قانون کا پابند نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مجھے یہ منظور نہیں ہے کہ کوئی میرا سو ل کبیت مجھے خریدے اور بیچ ڈالے۔ مہمان نوازی اور فیاضی کی بہترین توفیق صرف ہماری مرضی ہی سے متعلق نہیں ہیں بلکہ انکا

تعلق قسمت سے بھی ہے۔ جب مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں تمہارے لئے زیادہ مفید ثابت نہیں ہوسکتا، تمہیں میری حاجت نہیں ہے، تم مجھے کچھ نہیں سمجھتے، تو اس صورت میں میں تمہارے پاس نہ رہونگا، اگرچہ تم مجھے دُنیا ہی کیوں نہ بخش دو۔ حق تو یہ ہے کہ سوائے پسندیدگی کے اور کوئی خدمت کوڑی کام کی نہیں ہے۔ جب میں نے کسی کی ملازمت کرنے کا ارادہ کیا تو مجھے یہ کام ایک ذہنی تماشا سا ثابت ہوا۔ بس اس کے علاوہ اس کی اور کوئی حقیقت نظر نہ آئی۔ وہ تمہاری خدمات سے مستفید ہو کر تمہیں اس طرح جدا کر دیتے ہیں جیسے ہم دودھ سے مکھی کو نکال کر پھینکدیا کرتے ہیں۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ تم ان سے محبت کرو پھر تمہاری قدر بھی ہوگی اور تم سے ہمیشہ خوش رہینگے۔



تجرد اور تاہل پر ایک نظر

از لارڈ بیکن

جو شخص اہل و عیال والا ہوتا ہے، اُس کے لئے یہ سمجھنا چاہیئے کہ گویا اس نے اپنی فارغ البالی کو بطور یرغمال کے دیدیا ہے، اس وجہ سے کہ بال بچوں کی وجہ سے اُس کو بڑے بڑے کاموں کے انجام دینے میں خواہ وہ کام اچھے ہوں یا بُرے رکاوٹیں حائل معلوم ہوتی ہیں۔ حقیقت میں رفاہِ عام کے قابل وقعت کام ایسے ہی آدمیوں نے کئے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی عالم تجرد میں گذاری ہو یا یہ کہ وہ لاولد رہے ہوں۔ انکی محبت اور ان کے ذرائع پبلک ہی کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں اور انہیں کو مستفید بھی کرتے ہیں، تاہم اولاد والوں کے لئے یہ ایک بڑی

دلیل ہو سکتی تھی کہ ان کو اپنے مستقبل کے واسطے بڑی بڑی فکریں واندیشے ہونی چاہیئے تھیں اور اس کے لئے ان کو آئندہ کے واسطے بہت اچھے انتظامات کرنے پڑتے۔ بہت سے ایسے ناسمجھ آدمی جو اگرچہ مجرد رہتے ہیں پھر بھی ان کے خیالات انھیں کی ذات تک محدود رہتے ہیں اور وہ آئندہ کے لئے کوئی فکر نہیں کرتے۔ اور ایسے بھی آدمی ہوتے ہیں جو اپنے بیوی بچوں کو اخراجات کا باعث سمجھتے ہیں۔ یہ ہی نہیں بلکہ اور بہت سے دولتمند حریص بھی ہوتے ہیں جو اہل وعیال کے نہ ہونے پر فخر کرتے ہیں اس وجہ سے کہ ان کے ہونے سے ان کی امارت جاتی رہیگی۔ غالباً انھوں نے یہ بات سنی ہوگی کہ جو شادی نہ کرے وہ بڑا دولت مند آدمی ہو جاتا ہے یا جس شخص کے اولاد نہ ہو وہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے کہ بال بچوں کا بہت خرچ ہوتا ہے یعنی یہ کہ بال بچوں کا ہونا دولتمندی کے لئے ایک قسم کی رکاوٹ ہے۔ مجرد رہنے کا سب سے زیادہ معمولی سبب آزادی کی خواہش ہے۔ یہ بات خاص طور پر چند ایسے لوگوں میں پائی جاتی ہے جو خوش مزاج اور ظریف ہوں یہ ہی لوگ معمولی سے معمولی بندشوں کے لئے بھی اسقدر ذکی الحس

ہوتے ہیں کہ شاید وہ ذرا ذرا سی چیزوں کو ہتکڑیاں اور بیڑیاں سمجھتے ہیں
مجرد آدمی نہایت بہتر دوست، نہایت اچھے آقا اور ملازم ثابت ہوتے
ہیں مگر وہ ہمیشہ اچھی رعایا ثابت نہیں ہوتے اس وجہ سے کہ ان کو
بھاگ جانے میں کوئی امر مانع نہیں ہوتا اور قریب قریب تمام مفرورین
اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ پادریوں کے لئے تجرد کی زندگی زیادہ موزوں
ہوتی ہے اس وجہ سے کہ خیرات کے روپیہ پیسے سے ان کو ذاتی اخراجات
بمشکل چل سکتے ہیں، چہ جائیکہ وہ ایک اچھے خاصے کنبے کے کفیل ہوسکیں
ججوں اور منصفوں کے لئے یہ دونوں پہلو برابر ہیں، کیونکہ اگر وہ رشوت
خوار اور بدمعاش ہوں تو ایک نوکر بیوی سے پانچ گنا صرف ثابت ہوگا
اس وجہ سے کہ سپاہیوں میں میں نے عموماً فوج کے افسروں کو دیکھا
کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے دلوں میں مردانگی کے خیالات پیدا
کردیتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ بیوی بچوں کا ہونا ایک قسم کی انسانیت
کی تہذیب ہے اور مجرد آدمی گو وہ شادی شدہ لوگوں کے مقابلہ میں
کتنے ہی زیادہ مخیر کیوں نہ ہوں، ان کے ذرائع آمدنی کم ختم ہونے والے
ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے وہ بہت ظالم اور سنگدل ہوتے ہیں۔

مگر سخت بازپرس کے کاموں کے لئے زیادہ موزوں ہوتے ہیں اس لئے یہ ہے کہ رحمدلی کے جذبات ان میں کثرت سے پیدا نہیں ہوتے سنجیدہ اور متین لوگ عموماً محبت کرنے والے شوہر ہوتے ہیں۔ یہ بات انہیں رسم و رواج سے منتقل ہو جاتی ہے جیسے پولیس کی نسبت کہا گیا تھا۔ پاکدامن عورتیں اکثر مغرور اور غیور ہوا کرتی ہیں اس وجہ سے کہ ان کو اپنی عفت پر ناز ہوتا ہے۔ عفت مآبی اور اطاعت بیوی میں خاص صفات ہوتی ہیں۔ اگر کوئی عورت اپنے شوہر کو صاحب فہم خیال کرے تو یہ اسکی اطاعت پذیری اور عفت مآبی کا بہترین ثبوت ہو سکتا ہے اور اگر وہ اپنے شوہر کو بدگمان پائے تو ایسا کبھی نہیں کرے گی۔ بیویاں جوان آدمیوں کی بیگم ہوتی ہیں۔ ادھیڑ عمر والوں کی ساتھی ہوتی ہیں اور بوڑھے آدمیوں کی خادمہ ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص کبھی شادی کرنا چاہے تو اس کے خیال کی مخالفت میں کافی وجوہ موجود ہیں۔ لیکن تاہم ایسے شخص کو ایک عقلمند آدمی نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس کو کب شادی کرنا چاہئے؟ ایک جوان آدمی کو ابھی نہیں اور ایک بوڑھے آدمی کو بالکل نہیں۔ یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ

بدمزاج آدمیوں کو بہت اچھی بیویاں ملا کرتی ہیں۔ خواہ اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ اپنے خاوند کی محبت کو جبکہ وہ محبت کرے دوبالا کردیں یا شاید یہ بیویاں صبر کرنے کو زیادہ باعث فخر سمجھتی ہیں۔ اگر بدمزاج شوہر کو اُس نے خود منتخب کیا ہے تو بدمزاج شخص کے ساتھ عورت کا سلیقہ مند ہونا ہمیشہ واقع ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ ان کی بے وقوفی کا نتیجہ ہے اور اُن کو خود بھگتنا چاہیئے۔ فقط



اِشتباہ

از لارڈ بیکن

شبہات کی خیالات میں ایسی حیثیت ہوتی ہے جیسے پرندوں میں چمگادڑوں کی۔ اس وجہ سے کہ وہ جھٹپٹے کے وقت ہمیشہ اڑا کرتی ہیں۔ شبہات کو دل میں نہ آنے دیا جائے تو اچھا ہے یا اُن پر نگاہ رکھی جائے کہ وہ آنے نہ پائیں اس وجہ سے کہ جب وہ دماغ پر چھا جاتے ہیں تو اچھے اچھے دوستوں سے تعلقات منقطع ہو جاتے ہیں اور کاموں کی انجام دہی میں حارج ہوتے ہیں جس کی وجہ سے کام میں تسلسل قایم نہیں رہتا۔ شبہات بادشاہوں کے لئے ظلم و استبداد کا باعث ہوتے ہیں، خاوند کیلئے بدگمانی کا اور عقلمندوں کے لئے تلون مزاجی اور رنج و فکر کا۔ وہ دل کی کمزوری نہیں کہلاتے بلکہ وہ دماغ کی کمزوری ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ وہ ایسی

طبائع میں پیدا ہوا کرتے ہیں جن کے قوائے جسمانی اچھی حالت میں ہوں چنانچہ اس کی نظیر انگلستان کا بادشاہ ہنری ہفتم تھا۔ یہ نہایت شکی اور جسمانی حیثیت سے مضبوط آدمی تھا۔ اس سے زیادہ شکی اور مضبوط آدمی ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ ایسی صورتوں میں شبہات کم ضرر رساں ہوتے ہیں اس وجہ سے کہ ایسی طبائع میں بغیر اس بات کی جانچ کئے ہوئے پیدا نہیں ہوتے کہ آیا وہ شبہات ہیں یا نہیں ہیں؟ لیکن خوف وہراس کے جذبہ کو جلد قبول کرنے والی طبیعتوں میں شبہات بہت جلد جگہ کر لیتے ہیں۔ واقعات کی کم علمی کی وجہ سے زیادہ شبہات پیدا ہوتے ہیں اس لئے آدمی کو چاہیئے کہ واقعات کی چھان بین کرکے ان شبہات کو رفع کرلے۔ زیادہ عرصہ تک ان کو دل میں قایم نہ رہنے دے انسان کیا چاہا کرتے ہیں؟ کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جن آدمیوں کو وہ ملازم رکھتے ہیں تو کیا ان سے اس معاملہ میں کوئی لغزش ہی نہ ہوگی؟ وہ کیوں یہ خیال نہیں کرتے کہ ملازموں کے ذاتی اغراض بھی ہونگے اور وہ اپنے آقا کے مقابلہ میں اپنی ذات کے لئے زیادہ فائدہ پہنچانیوالے ثابت ہونگے اسلئے شکوک کی تعداد کو اعتدال پر لانے کیلئے اس سے زیادہ

کوئی بہتر طریقہ نہیں ہے کہ ایسے شبہات کو سچ سمجھ لیا جائے اور انکو شکوک کی مانند اپنے دل میں روکے رکھا جائے کیونکہ انسان کو شکوک کیساتھ ایسی رواداری کا برتاؤ رکھنا چاہئے یعنی وہ یہ سمجھے کہ شکوک تو سچے ہیں لیکن انکے لئے (جنپر شبہ ہو) باعث اذیت نہوں شبہات جو انسان کے دلمیں خود پیدا ہوتے ہیں انکی کوئی حقیقت نہیں ہوتی بلکہ وہ شبہات جو ایجاد بندہ ہوتے ہیں اور جن کے متعلق دوسروں کی گفتار و کردار سے یقین دلایا جاتا ہے بہت خطرناک ہوتے ہیں حقیقت میں شبہات کے خار دار جنگل کو صاف کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جن لوگوں پر اُسے شبہ ہو اُنسے اس شبہ کو صاف دل سے کہدے اس وجہ سے کہ ایسا کرنے سے اسکو ان لوگوں کے سچے سچے واقعات اچھی طرح معلوم ہو جائینگے جس کی وجہ سے وہ لوگ آئندہ بہت احتیاط سے کام لینگے کہ پھر ان پر شبہ کا موقع بھی نہ ملے۔ یہ طریقہ کم ظرف لوگوں کیلئے سودمند نہیں ہوسکتا اس وجہ سے کہ اگر انکو ایک مرتبہ ذرا سا بھی شبہ ہو جائے وہ کبھی صاف نہیں ہوسکتے۔ اٹلی زبان میں کیا اچھی ضرب المثل ہے کہ "شبہ ایمان کو غارت کر دیتا ہے" درحقیقت اس سے یہ کام لینا چاہئے کہ ایمان مستحکم ہو جائے۔ فقط

اِنتقام

از لارڈ بیکن

بدلہ ایک قسم کا وحشیانہ انصاف ہوتا ہے، انسان کی فطرت جتنی اس کی طرف مائل ہوتی جائے اتنا ہی قانون کو لازم ہے کہ اس کو فطرت انسانی سے نیست و نابود کرنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ پہلی خطا کے متعلق یہ خیال ہے کہ وہ صرف قانون کی خلاف ورزی متصور ہوتی ہے لیکن اس پہلی خطا کا بدلہ لینا قانون کو معطل کر دینے کے مرادف ہے انتقام لینے میں حق تو یہ ہے کہ انسان اپنے دشمن کا ہم پلہ ہوتا ہے اور خطا سے درگزر کرنے والا شخص رتبے میں اپنے حریف سے بڑھا ہوا ہوتا ہے اس وجہ سے کہ خطاؤں کو نظر انداز کرنا بڑے ظرف والوں ہی کا حصہ ہے حضرت سلیمان علیہ السلام و علی نبینا کا قول ہے کہ "جو شخص خطاوں

سے درگزر کرتا ہے وہ عالی حوصلہ ہے" چنانچہ مثل مشہور ہے کہ "گذشتہ گذشت" اور یہ بات ناقابل تلافی ہے' عقلمند لوگ صرف واقعاتِ حاضرہ و مستقبل ہی کو قابلِ التفات سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ گذشتہ واقعات کے متعلق خود نہ کسی قسم کی جانفشانی اُٹھاتے ہیں اور نہ اُن میں کوئی حصہ لیتے ہیں۔ کوئی شخص خطا کو خطا سمجھکر اس کا مرتکب نہیں ہوتا بلکہ وہ یہہ سمجھتا ہے کہ اِس سے اُسے فائدہ پہنچے گا' خوشی حاصل ہوگی یا عزت و حرمت کے سامان فراہم ہونگے۔ غرض اسی قسم کے خیالات اُس کے دل میں ہوتے ہیں۔ اس بناء پر جو شخص مجھ سے زیادہ اپنی ذات سے محبت رکھتا ہے تو اُس سے کیوں ناراض ہونا چاہیے؟ اور اگر کوئی شخص بمقتضائے فطرت کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو کرنے دو' اس وجہ سے کہ وہ ان کانٹوں یا کاٹے وار درختوں کی مانند ہے جن سے تکلیف ہی پہنچتی رہتی ہے اس وجہ سے کہ ان کا یہ ہی شیوہ ہے۔ سب سے زیادہ قابل درگذر وہ انتقام ہے جو ایسی خطاؤں کے متعلق ہو جن کے تدارک کے لئے قانون ساکت ہے۔ اِس لئے انسان کو ایسی خطاؤں کے متعلق اس قسم کے بدلہ لینے کا خیال کرنا چاہیے جو قانون کی زد میں نہ آسکے۔ بصورتِ دیگر

انسان کے بجائے ایک کے دو دشمن ہو جاتے ہیں (یعنی ایک اس کا حریف اور دوسرا قانون) بعض لوگ انتقام کے لئے اس بات کے متمنی ہوتے ہیں کہ حریف کو معلوم ہو جائے کہ یہ بدلہ کس جرم کی پاداش میں لیا گیا ہے۔ یہ انتقام بہت کشادہ دلی پر مبنی ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ بذاتِ خود اپنے دشمن کو نقصان پہنچا کر خوش ہونا نہیں چاہتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ اس کا مخالف اپنی کردار سے توبہ کرے۔ لیکن پاجی اور مُتنفّی لوگوں کی انتقام کے بارے میں ایسی حیثیت ہوتی ہے جیسے اندھیرے میں تیر چلا دیا جائے۔ کاسمس فلارینس کے ڈیوک نے دغا باز یا غافل دوستوں کے متعلق ایک دلیرانہ بات کہی ہے گویا ایسے دوستوں کی خطائیں ناقابلِ معافی ہیں۔ وہ کہتا ہے دیکھو! تم نے یہ تو پڑھا ہو گا کہ "ہمیں اپنے دشمنوں کی خطاؤں کو معاف کر دینا چاہئے" کیا تم نے کہیں یہ بھی پڑھا ہے کہ "دوستوں کی خطاؤں کو معاف کر دینا چاہئے" لیکن اسکے قول کی ماہیت زیادہ موافقت کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ کیونکہ وہ کہتا ہے کہ "کیا یہ کوئی پسندیدہ حرکت ہے کہ ہم خدا کے رحم و کرم کو تو سینے سے لگائیں اور مصائب کی برداشت سے جی چرائیں؟ یہ تو وہی مثل ہے کہ کڑوا کڑوا

تھو تھو اور میٹھا میٹھا ہپ ہپ۔ پس اسی نسبت سے دوست پر بھی یہ ہی بات صادق آتی ہے۔ یہ تو بالکل سچ بات ہے کہ جو شخص بدلہ لینے کا خیال دل میں رکھتا ہے وہ زخموں کو گویا ہرا رکھتا ہے۔ اگر وہ انتقام کا خیال دل میں نہ رکھے تو یہ زخم مندمل ہوجاتے ہیں اور اچھے ہوجاتے ہیں۔ عوام کے خلاف جرایم کا انتقام اسقدر قابل مذمت نہیں ہے مقابلتاً قابل ستائش ہے جیسے قیصر کی موت کا بدلہ، پرٹینکس کی موت کا بدلہ، فرانس کے ہنری سوم کی موت بدلہ اور اسی طرح اور بہت سے ہیں۔ لیکن خانگی انتقاموں میں ایسا نہیں ہوتا، نہیں بلکہ انتقام لینے والے شخص کی زندگی برباد ہوجاتی۔ یعنے جو لوگ جسقدر مفسد ہوتے ہیں اسیقدر بدقسمتی پر انکا انجام بھی ہوتا ہے۔



دائرہ

ترجمہ از مسٹر ایمرسن

آنکھ پہلا دائرہ ہے اس سے جو افق بنتا ہے وہ دوسرا دائرہ ہے اور عالم فطرت میں اس ابتدائی شکل کی تکرار بلا اختتام کو جاری رہتی ہے۔ دنیا کے نقوش میں یہ سب سے قابل وقعت علامت ہے۔ سینٹ اگسٹائن نے ایشور عزّوجل کی قدرت کو ایک دائرہ سے تشبیہ دی ہے جس کا مرکز ہر جگہ ہے اور جس کا محیط نا متناہی ہے۔ یہ جو تمام اشکال میں سب سے اول ہے اس شکل کے وسیع ادراک کے متعلق ہم زندگی بھر پڑھتے چلے آرہے ہیں۔ ہر انسانی فعل کو دائرہ فرض کرکے ہم ایک نتیجہ نکال چکے ہیں۔ اب دوسری تشبیہ قایم کرکے ہم یہ دریافت کرینگے کہ انسان کے ہر فعل میں یہ قابلیت موجود ہے کہ وہ اس کے پہلے کام سے بڑھ جائے۔ ہماری زندگی مدافعت کے لئے ایک قسم کی نوآموزی

ہے وہ یہ کہ ہر دائرے کے باہر ایک اور دائرہ بنایا جا سکتا ہے اور یہ کہ فطرت میں کوئی آخری سرا نہیں ہے بلکہ آخر ایک آغاز ہے یعنی ہر دوپہر کے بعد ہمیشہ دوسری صبح طلوع ہوتی ہے اور ہر سمندر کی تہ میں ایک اور عمیق سمندر نکلتا ہے۔

یہ حقیقت ہر شعبہ میں انسانی قوت کے کام کرنے کی بہت اچھی مثال ہو سکتی ہے کیونکہ یہ حقیقت ایک حد تک ذات نامحدود کے اس وجود کا تصور پیش کرتی ہے جو کامل وسیلہ ہے اور جس تک انسان کی دسترس ممکن نہیں اور جو ہر کوشش و کامیابی کی تحریک دلانے والی اور پھر ناکارہ ثابت کر دینے والی بھی ہے۔

عالم فطرت میں کسی قسم کا ثبات نہیں ہے۔ عالم کائنات بالکل رفتنی و گذشتنی ہے۔ استقلال کی وقعت محض خیالی وقعت ہے۔ اللہ عزّوجل کے نزدیک ہماری دنیا کی حقیقت بہترین قانون کی سی ہے، واقعات کے مجموعے کی سی نہیں ہے۔ ہماری تربیت کی بنا خیالات کے غلبہ پر منحصر ہے جو شہروں اور تعلیم گاہوں کو اپنے پیچھے کھینچے لئے چلا جا رہا ہے۔ کسی خیال پر غور کرتے وقت اگر ہم دوسرے خیال پر غور کرنے لگیں تو پہلے

خیالات غائب ہو جائیں گے۔ چنانچہ یونانیوں کا فن سنگ تراشی قطعی معدوم ہو چکا ہے۔ اس کی اب ایسی حالت ہوگئی ہے کہ گویا وہ برف کی سورتیں تھیں، جن کی کہیں کہیں ایسی نشانیاں پائی جاتی ہیں جیسے کہ ہم جون یا جولائی کے مہینے میں پہاڑوں اور گھاٹیوں میں برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو اِدھر اُدھر پڑا ہوا دیکھا کرتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ جس فراست نے جو باتیں انھیں سمجھائی تھیں اب اسی فراست نے دوسری باتیں ہمیں اور سمجھا دی ہیں۔ یونانیوں کا علم و حکمت یہ سچ ہے کہ کچھ دنوں قایم رہا مگر اب اس پر وہ ہی حکم لگایا جا سکتا ہے اور ایسی خستہ حالت میں ہے جیسی نئے خیالات نے پرانی چیزوں کی ابتر حالت کر دی ہے چنانچہ نئے براعظم پرانی دنیا کے کھنڈرات سے بنائے جا رہے ہیں، نئی نسلوں کا طرز عمل پرانی نسلوں سے جدا گانہ ہے۔ حق تو یہ ہے کہ نئے فنون پرانے فنون کو معدوم کر دیا کرتے ہیں۔ پرانے اعلیٰ درجہ کے پلوں کو دیکھو وہ پانی میں زور پیدا کرنے کی نئی ایجادات سے بیکار کر دیئے گئے ہیں۔ مستحکم قلعوں کی بارود کی ایجاد سے کوئی حقیقت نہیں رہی۔ سڑکوں اور نہروں کی ریلوں کے آگے کوئی اصلیت نہیں رہی۔ بادبانوں کی کشتیوں

کی بھاپ سے چلنے والی کشتیوں کے آگے اور بھاپ سے چلنے والی کشتیوں کی بجلی کی ایجاد کے آگے کوئی وقعت نہیں رہی۔
تم اس سنگِ مرمر سے بنے ہوئے مضبوط مینار کی تعریف کرتے ہو جو مدتوں سے سردی اور گرمی کے موسموں کی سختیاں برداشت کرتا چلا آرہا ہے۔ تاہم اس بلند مینار کو کسی کے کانپتے ہوئے ہاتھوں نے بنایا تھا اور حق تو یہ ہے کہ صانع 'مصنوع' سے ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔ جو شخص جو چیز بناتا ہے وہ اس کو بہت جلد بگاڑ بھی سکتا ہے۔ وہ نظر نہ آنے والا خیال جو مینار کے بنانے کے لئے پیدا ہوا تھا حقیقت میں وہ ہاتھ سے زیادہ بہتر اور قابل وقعت تھا اور اس طرح ہمیشہ ایک حد سے نتیجے کے پیچھے ایک نازک سبب ہوا کرتا ہے جس کو اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ خود ایک اور نتیجے کا زیادہ نازک سبب نظر آئے گا۔ جبتک کسی چیز کا راز نہ معلوم ہو اس وقت تک وہ پائدار ہی معلوم ہوتی ہے۔ عورتوں کو ایک زرخیز جائداد مستقل اور پائدار معلوم ہوا کرتی ہے' وہ ہی جائداد ایک تاجر کو ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا وہ اینٹ اور چونے سے بنائی گئی ہے اور آسانی سے فنا ہو سکتی ہے۔ شہر کے رہنے والے کو ایک باغ کی اچھی

پیداوار، اس کی اچھی زمینیں، غرض یہ سب چیزیں ایسی زرخیز اور مستقل معلوم ہوا کرتی ہیں جیسے سونے کی کان یا دریا مگر یہ سب چیزیں ایک کسان کو صرف پیداوار کے ذرائع معلوم ہوا کرتے ہیں۔ عالم کائنات ہم کو نمایاں طور پر مستقل اور باثبات معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں ایسا معلوم ہوتے کا ہر چیز کی مانند ایک سبب بھی ہوتا ہے اور جب ایک مرتبہ یہ بات میری سمجھ میں آجائے تو پھر مجھے کیا یہ گمان بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کھیت ہمیشہ ایسے ہی سرسبز و شاداب رہیں گے؟ کیا تیو نکی یہ بہتات اسی طریقے سے قایم رہے گی؟ حق تو یہ ہے کہ استقلال اور ثبات کی خیالی وقعت ہے۔ ہر چیز اپنی اوسط پر قایم ہے۔ روحانی قوت کے سامنے چاند کی گیند سے زیادہ وقعت نہیں ہے۔

ہر شخص کی کنجی اس کا خیال ہوا کرتا ہے۔ وہ شخص کیسا ہی سخت اور سخت گیر کیوں نہ ہو مگر وہ خیال جس کا وہ محکوم ہے اس کے لئے رہبری کا کام کرتا ہے حقیقت میں یہ ہی وہ خیال ہے جس میں اس کے تمام واقعات کی تفصیل پنہاں رہتی ہے۔ اس شخص کی اصلاح اس طرح ہو سکتی ہے کہ اس کے خیال سے بہتر کوئی اور خیال اس کو دکھایا جائے

انسان کی زندگی ایک دائرہ ہے جو خود بخود پھیلتا ہے۔ یہ دائرہ پہلے ایک چھوٹا سا دائرہ ہوتا ہے جو محسوس بھی نہیں ہوتا۔ پھر رفتہ رفتہ چاروں طرف پھیلتا اور دائرے پیدا کرتا جاتا ہے اور ان دائروں کی پیداوار نامتناہی ہوتی ہے۔ ان دائروں کی حلقہ در حلقہ پہنچنے کی وسعت اس شخص کی روح کی صداقت پر منحصر ہوتی ہے۔ اس وجہ سے کہ ہر خیال میں یہ جدوجہد مضمر ہوتی ہے کہ اس قسم کا پیچ در پیچ واقعہ بن جائے مثلاً کسی ملک کی ہیئت یا قوا عد فن یا کوئی مقامی رسم یا کوئی مذہبی شعار۔ اور یہ کہ اس کے ہر خیال میں یہ جدوجہد بھی پنہاں رہتی ہے کہ اسی واقعہ کے اوپر وہ اپنے آپ کو وابستہ کرے اور زندگی کی تقویت اور حدبندی کا سبب ہو جائے لیکن اگر اس شخص کی روح قوی اور تیز ہوتی ہے تو ان حدود کو (یعنے اپنے خیال کی بناء پر حسب حالت ترقی پر انسان پہنچ چکا ہے۔ مترجم) توڑ کر نکل جاتی ہے اور اس بحر محیط میں ایک وسیع تر دائرہ بناتی ہے (مراد ترقی سے ہے۔ مترجم) جو پھر ایک موج کی صورت میں آگے پھیلتا ہے۔ اس کوشش کے ساتھ کہ پھر بصورت دائرہ محدود اور پابند ہو جائے۔ لیکن انسان کی طبیعت اس حدبندی سے ابا کرتی

ہے چنانچہ بالکل ابتدائی اور نہایت تنگ حالات میں بھی طبیعت کلیسائی
بڑی قوت کے ساتھ آگے بڑھنے اور بیکنار وسعت تک پھیلنے کا ہوتا ہے
کسی واقعہ کو ہر ختم کرنے والا واقعہ ایک نئے سلسلۂ واقعات کا آغاز
ہوتا ہے۔ ہر عام قانون کسی زیادہ جامع اور بڑے قانون کی جو آئندہ
جلد ظاہر ہو جائے گا محض ایک کڑی ہوتا ہے۔ ہمارے لئے کوئی بیرونی
احاطہ کرنے والی دیوار نہیں ہے۔ انسان جب اپنا قصہ ختم کرتا ہے تو
وہ کیسا اچھا کیسا محیط ہوتا ہے اور وہ تمام واقعات کی صورت کیسے بدل
دیتا ہے۔ پھر بھی وہ سارے منظر پر ختم ہوتا ہے لیکن کچھ دیر نہیں گزرتی
کہ دوسری طرف ایک اور آدمی نمودار ہوتا ہے اور اس دائرے کے
اطراف ایک اور دائرہ بناتا ہے جس کو ہم ابھی دائرہ نظر کی انتہا قرار
دے چکے تھے۔ تب ہمارا پہلا قصہ گو محض متقدم رہجاتا ہے اور انسان
کا جامع و معنی خیز لفظ اس کے لئے صادق نہیں رہتا اور اب اس کی
تلافی کی شکل صرف یہ رہجاتی ہے کہ وہ اپنے حریف کے گرد ایک اور
بڑا دائرہ بنا دے۔ اور حقیقت میں لوگ اسی طرح کرتے بھی رہتے ہیں۔
جو نتیجہ آج برآمد ہوا ہے اور دل و دماغ کو پریشان کر رہا ہے وہ کل

ایک نقطۂ نظر میں کھینچ آنے کا دروازہ اب وا ہو چکا ہے۔ آج یہ فہم ہوتا ہے کہ ہر شے قطرہ مکمل ہو گئی کل وہ شخص سمجھے کہ ایسا عالم تہذیب مثال رہا ہوگا آنے والے خیال میں ایک قوت ہوتی ہے جس سے صرف تمہارا مذہب ہی نہیں بلکہ تمام مذاہب حتیٰ کہ تمام دنیا کے علوم و فنون کو الٹ سکتی ہے اور جیسے وہ ہی قوت تھیں ایسی کہ کچھ کر دیا تو ہر کر سکتی ہے جس کو کسی بڑے سے بڑے شاعر نے کبھی نہ خواب میں دیکھا ہوگا اور نہ اس کو خیال کیا ہوگا ہر شخص دنیا میں خود کاریگر نہیں ہوتا بلکہ وہ اس بات کا ایک اشارہ ہوتا ہے کہ اس کو کس قسم کا آدمی ہونا چاہئے۔ اسی طرح موجودہ نسل سے آنیوالی نسل کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ہم آنے والی نسلوں کے اس بڑے زینے کی سیڑھی پر سیڑھی چڑھتے ہیں۔ یہ زینے افعال ہیں اور ہر منظر قوت ہے۔ ہر نتیجہ جس پر ہم پہنچتے ہیں آنے والے نتائج کی کسوٹی پر وہ جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص پرانی باتوں کو چھوڑتا جاتا ہے اور نئی باتیں اختیار کرتا جاتا ہے گویا کہ اس کی حد بندی صرف مشاہدات سے ہو سکتی ہے۔ نئی باتیں ہمیشہ پرانی باتوں کے لئے قابل نفرت ہوتی

ہیں اور وہ لوگ جن کے پرانے خیالات ہوں ان کی نظر میں ہر نئی چیز بدعت و ایجاد کا غار بن جاتی ہے۔ لیکن نئی چیزوں کے لئے آنکھ بہت جلد عادی ہو جاتی ہے اس وجہ سے کہ ان کی خوبیاں اور معصومیت ظاہر ہو جاتی ہے۔ لیکن تھوڑی دیر میں اسکی قوت زائل اور آنیوالی ساعت کے انکشاف کے سامنے یہ ماند ہو کر غائب ہو جاتی ہے

نئے کلیات سے خوف نہ کھاؤ۔ یہ امر تم کو بے کار اور بے سود معلوم ہوتا ہے اور کیا تم کو اس سے یہ اندیشہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے تمہاری روحانیت کے نظریہ پر کوئی برا اثر پڑے گا؟ اس کلیہ کی مخالفت نکرو اس وجہ سے کہ اس سے بھی تمہارے نظریہ کے تصفیہ اور ترقی میں اتنی ہی مدد ملے گی۔

اگر ہم اور آگے سوال کریں تو یہ ظاہر ہوگا کہ انسان کے خیالات میں ثبات نہیں ہے۔ ہر شخص خود یہ خیال کرتا ہے کہ اس کی بات کسی نے ٹھیک طرح سمجھا نہیں ہے۔ مگر حق تو یہ ہے کہ اگر اس میں ذرا بھی صداقت ہے اگر اس کا بھروسہ خدا پر ہو تو پھر اس صورت میں ایسا ہونا بھی ہے۔ اس کو محسوس کرنا چاہئے کہ علم کا انتہائی دروازہ اور آخری حجرہ

کبھی نہ کھل سکا اس کے متعلق ہمیشہ ایک ایسا طے شدنی حصہ باقی رہ گیا جو کبھی حل نہ ہو سکا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ وہ ابھی بہت کچھ کر سکتا ہے۔

ہمارے افعال بھی ایسے ہوا کرتے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے پر اعتماد نہیں ہوتا۔ آج میرے دماغ میں خیالات کی کثرت سے آمد ہے اور میں جو کچھ چاہوں لکھ سکتا ہوں۔ میں اس بات کے لئے کوئی وجہ نہیں پاتا کہ کل مجھ میں وہ ہی خیالات اور وہ ہی قوت بیان کیوں نہ ہونی چاہئے۔ جو کچھ میں محسوس یا جب میں کسی خیال کو لکھتا ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات بالکل قدرتی اور معمولی ہے۔ لیکن کل میرا دماغ اس قسم کے خیالات سے بالکل خالی خولی تھا جس میں میں آج خیالات کی اسقدر فراوانی پاتا ہوں اور ایک مہینہ گزر جانے کے بعد تو یقیناً مجھے تعجب ہوگا کہ اتنے مسلسل صفحات کس نے لکھے ہیں۔ اس غیر مستقل ناپائدار عقیدہ پر افسوس ہے۔ یہ کبھی ایک حالت پر نہ آئے گا اس لئے کہ یہ چیز ہی طغیانی کا بڑا جزو ہے۔ ایک طرف تو میری فطرت میں ربانی قوتیں پوشیدہ ہیں اور دوسری طرف میں ایسا بے حقیقت ہوں جیسا کسی خانہ ویران کا سبزہ ہوتا ہے۔

اپنی حیثیت سے زیادہ اپنے آپ کو بلند دکھانے کی کوشش کرنا
یعنی اپنی انتہائی حالت سے بھی آگے بڑھ جانے کی کوشش کرنا
انسانوں کے ایسے کئی صفات ہیں اور کوشش کا بھید کھل جاتا ہے
ہماری دلی تمنا یہ ہوتی ہے کہ لوگ ہماری قدر کریں تاہم قدر دان کو ہم
معاف نہیں کر سکتے۔ فطرت کو یہ چیز سب سے زیادہ پسند ہے کہ دوست
سے بھی اگر میرا جامع صفات کوئی دوست ہو تو اس کی ان تمام
پر غور کر کے مجھے اپنی کمزوریوں سے تکلیف ہوا کرتی ہے کسی دوسرے
کی محبت سے فریقِ ثانی کو ملزم ٹھیراتی ہے۔ اگر وہ حقیقت میں تما
قابل قدر ہوتا کہ میں اس سے کم رتبہ ہوتا تو ایسی صورت میں میں اس
سے محبت رکھ سکتا اور اپنی محبت کے ذریعہ بلند تر ہو جاتا۔ حق تو یہ ہے
کہ انسان کی ترقی اس کے دوستوں کی حق بجانب تعریف کی بنا پر
معلوم ہوا کرتی ہے۔ اس وجہ سے کہ صداقت کے لئے وہ جس شخص سے
قطع تعلق کرتا ہے اس کو دوسرا دوست اس سے بہتر مل جایا کرتا ہے
جس وقت میں جنگل میں ٹہل رہا تھا اور اپنے دوستوں کی حالت پر
غور کر رہا تھا تو میں نے یہ خیال کیا کہ ان کے ساتھ ایسی دوستی رکھنا جو

بُت پرستی کی حد تک پہنچی ہو کوئی معنی نہیں رکھتی۔ جب میں [illegible]
اندھا بننا نہ چاہوں تو مجھے اچھی طرح نامی گرامی کہلانے والے لوگوں کی
حد نظر آتی ہے۔ ان لوگوں کا امیر ہونا، شریف ہونا اور بڑا ہونا محض
زبان کا اسراف ہے ورنہ حقیقت کچھ اور ہی ہے۔ اسے مبارک ذات
(اللہ جل شانہٗ سے مراد ہے۔ مترجم) جس کو میں نے ان لوگوں کی خاطر
چھوڑ رکھا ہے یہ وہ لوگ نہیں ہیں جو تو ہے۔ ہر ذاتی مصلحت کے
موقع میں جیسے ہم جائز رکھتے ہیں ربانی نعمتوں سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔
ہم ذرا دیر کی غیر معتدل خوشی کی خاطر تخت ملائکہ سے محروم ہو جاتے ہیں
کتنی ہی مرتبہ ہم کو یہ سبق ملا ہوگا۔ جب ہمیں لوگوں کی حقیقت معلوم
ہو جاتی ہے تو ہماری نظر میں ان کے لئے کوئی دلکشی نہیں رہتی۔ جس
وقت تمہیں کسی شخص کی اصلیت معلوم ہو جائے تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ گویا
اس سے قطع تعلق ہو گیا۔ کسی شخص کا محدود ہونا کافی قصور ہے۔ خواہ
اس میں کیسے ہی اوصاف، عالی ہمتی اور فضیلت ہو۔ اگر اس میں یہ
باتیں ہوں بھی تو بیکار ہے۔ وہ ہی شخص کل تمہیں نہایت بہتر اور اچھا
معلوم ہوتا تھا، یعنی اس سے تمہاری بہت کچھ امیدیں وابستہ تھیں اور

وہ شخص تمہارے لئے بحرِ ذخار معلوم ہوتا تھا مگر اب جب تم نے اس کا کنارہ جا لیا تو وہ شخص محض ایک جوہڑ ہے اور پھر تمہیں اس کی کوئی پروا بھی نہ ہوگی کہ تم اس سے کبھی ملو۔

کسی خیال میں جب کوئی نیا خیال پیدا ہوتا ہے تو ہر خیال میں ایسا خیال سے ملتے جلتے بیسیوں اس کے ناموافق خیالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور پھر وہ ایک ہی قانون کے مظہر معلوم ہوتے ہیں۔ ارسطو اور افلاطون دو مختلف مذہبوں کے بانی مانے جاتے ہیں۔ مگر ایک عقلمند کو معلوم ہوگا کہ ارسطو میں فلاطونیت موجود ہے۔ خیالات میں ایک قدم آگے بڑھنے سے مختلف آرا متحد نظر آنے لگتی ہے اور ایک ہی اصول کے دو سرے دکھائی دیتے ہیں اور بایں ہمہ ہماری پرواز بھی اتنی نہیں ہو سکتی کہ جس کے بعد کسی بلند تر منظر کا امکان نہ رہے۔

جب اللہ عزوجل کسی عالی خیال حکیم کو دنیا میں پیدا کرتا ہے تو اس وقت سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ اس وجہ سے کہ تمام چیزیں معرضِ خطر میں رہتی ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جب کسی بڑے شہر میں آگ لگتی ہے تو کسی شخص کو اس کا علم نہیں ہوتا کہ کون کون اس آگ سے

محفوظ رہے گا اور وہ آگ کہاں جا کر بجھے گی۔ کوئی علم ایسا نہیں ہے جس میں کل تھوڑی بہت ترمیم نہ ہو جائے کوئی علمی شہرت ایسی نہیں ہے اور نہ کوئی دوامی مشہور و معروف چیزوں کے نام ایسے ہیں جن پر نظر ثانی نہ ہوتی ہو اور بیکار نہ کر دیے جاتے ہوں۔ حتیٰ کہ خاص انسان کی امیدیں، اسی کے دل کے خیالات، اقوام کے مذاہب، نسل انسانی کے اخلاق اور معاشرتی طریقے۔ یہ سب باتیں نئے کلیات کے آگے [illegible] حالت میں رہتی ہیں۔ کلیات سانچہ علم ربانی کی نئی آمد ہے جو ہمیشہ ہمارے نفس پر ہوا کرتی ہے اسی لئے جب اس کا ورود ہمارے نفس پر ہوتا ہے تو ایک لرزہ پیدا ہو جایا کرتا ہے۔

کسی شخص کی اجتماعی قوت منتشر ہو جائے اور پھر وہ اپنے آپ کو سنبھال لے حقیقت میں اسی کو شجاعت کہتے ہیں۔ پھر وہ شخص ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا اس کو کوئی اپنی جگہ سے نہ ہٹا سکتا ہے اور نہ کوئی اسکو پھر مغلوب کر سکتا ہے۔ یہ بات صرف اس طرح نصیب ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے گذشتہ صداقت کے مذبذب خیالات پر حقیقی سچے خیالات کو ترجیح دے اور حقیقت میں ایسا شخص صداقت کی خیالات

کو خواہ وہ کیسی ہی ہے اُسے میسر ہو، فوراً قبول کر لیتا ہے، اور اس شخص کو اس بات کا بھی یقین واثق ہوتا ہے کہ اُس کے مادی قوانین، معاشرتی تعلق، اس کے مذہب، اس کی دنیا غرض ان تمام چیزوں میں کبھی نہ کبھی تبدیلی ضرور ممکن ہے۔

عالی خیالی میں بھی درجے ہوا کرتے ہیں۔ ہم پہلے پہل تخیلات سے محض ایک علمی دلچسپی یا تفننِ طبع کا کام لیتے ہیں جیسے پہلے زمانہ میں لوگ مقناطیس کو محض ایک کھلونا سمجھا کرتے تھے۔ پھر شباب اور شاعری کے عروج کے وقت ہمیں نظر آتا ہے کہ شاید اس میں صداقت ہو۔ یعنی اس کی شعاعیں اور اجزاء کم سے کم حقیقی ہیں۔ اسکی صورت رفتہ رفتہ متانت اور استواری اختیار کرتی ہے اور ہمیں پھر معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ضرور حقیقی ہوگی۔ یہاں تک کہ اب اس میں اخلاقی اور علمی اوصاف نظر آجاتے ہیں۔ ہم پڑھتے ہیں کہ "خدا ہے" اور وہ ہم میں موجود ہے اور تمام چیزیں اسی کا پرتو ہیں۔ برکلے کا تخیل حضرت مسیح کے تخیل کا ادھورا اظہار ہے اور خود حضرت مسیح کا تخیل امرِ حقیقی کا یعنے اس حقیقت کا "نامکمل اظہار ہے یعنی یہ کہ تمام دنیا کی

کا ایک تیز بہاؤ ہے جو خود اپنی اصلاح کر کے ترقی پذیر ہوتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ تاریخ کی اور دنیا کی حالت کی واضح کیفیت ہے کہ گذشتہ کسی وقت میں ان کا محض ذہنی تقسیم پر انحصار تھا جو لوگوں کے دلوں میں وجود رکھتی تھی۔ جو باتیں انسان کو اس وقت عزیز معلوم ہوتی ہیں اور وہ اس وجہ سے کہ وہ اس کی ذہنی گہرائیوں سے پیدا ہوتی ہیں اور جس طرح ایک درخت میں تدریجی ترقی سے پھل لگا کرتے ہیں اسی طرح وہ اس تنظیم کا باعث ہوتی ہیں جس پر دنیا کا موجودہ نظام چل رہا ہے۔ کسی نئی ترتیب کا اگر ایک درجہ بھی حاصل ہو جائے تو وہ فوراً انسانوں کی انتہائی سے انتہائی کوششوں کو درہم برہم کر دے۔

گفتگو حلقوں کے ایک کھیل کی مثال ہوتی ہے۔ خموشی کی مشترکہ زمین کی جو چاروں طرف حدود ہیں ان کا اظہار گفتگو ہی میں ہوتا ہے۔ انسانوں کی جماعتیں جس جوش و خروش سے گفتگو میں حصّہ لیتی ہیں اور اس خوشی و خرمی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہیں ان جماعتوں کی جانچ ان کی گفتگو یا ان کے خیالات سے نہیں ہو سکتی اس وجہ سے کہ وہ گفتگو کے اس بلند مقام سے کل پیچھے ہٹ جائیں گے۔ پھر اس

سکے بعد تم انھیں دیکھو گے کہ وہ اپنی پرانی روش پر آ جاتے ہیں گے تاہم جو خیال ہمارے دل میں پیدا ہوتا ہے اس سے ہمیں ضرور محظوظ ہو لینا چاہئے۔ جب کوئی نیا مقرر کسی خیال میں کوئی نئی بات پیدا کرتا ہے تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس سے پہلے مقرر کی گفتگو کی الجھنوں سے آزاد ہو گئے۔ یہ مقرر کوئی نئی بات اس لئے پیدا کرتا ہے کہ اپنے خیال کی بلندی میں از سر نو ہمیں الجھا دے۔ پھر اس خیال کی بنا پر ہم زود سے نجات دہندہ کے ممنون ہوتے ہیں۔ پھر اس کے بعد ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہم حق پر آ گئے ہیں اور انسانوں میں ہمارا شمار ہونے لگا ہے۔ ہر صداقت کے اظہار میں ہر زمانہ یہ عجیب عجیب گہری سچائیاں اور تکمیل کرنے والی صداقتیں باقی جاتی ہیں ان کا کیا کہنا ہے۔ عام طور پر سوسائٹی حالت جمود اور غفلت میں رہتی ہے۔ ہم خالی الذہن ہو کر اس بات کے انتظار میں رہتے ہیں کہ شاید ہم میں اچھے خیالات پیدا ہو جائیں۔ مگر حق تو یہ ہے کہ ہم قابلِ قدر خیالات سے گھرے ہوئے رہتے ہیں۔ اگرچہ ہم ان کو ایسا نہیں سمجھتے بلکہ ان کو مذاق یا دل لگی کی باتیں سمجھا کرتے ہیں۔ اس حالت جمود میں ایک باخدا شخص پیدا ہوتا ہے

اور ان ہیجز آدمیوں کو بیدار کر دیتا ہے اور اپنی نگاہ سے اس پردے کو جلا کر خاک کر دیتا ہے جو تمام چیزوں پر پڑا ہوا تھا اور پھر تمام نمائشی چیزوں، مثلاً پیالے، تشتری، کرسی، گھڑی وغیرہ کی حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے۔ وہ باتیں جو کل ہیں بڑی با وقعت معلوم ہو رہی تھیں مثلاً جائداد، آب و ہوا، اولاد، ذاتی حسن و جمال غرض اسی طرح اور بہت سی چیزیں ان تمام چیزوں کی عجیب و غریب طریقے سے ہیئت بدل جاتی ہے جن چیزوں کو ہم پائدار سمجھے ہوئے تھے وہ متزلزل اور منتشر ہو جاتی ہیں اور علوم و فنون، شہر، آب و ہوا، مذاہب وغیرہ اپنی بنیاد چھوڑ دیتے ہیں اور تمہاری آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتے ہیں۔ پھر ان تمام چیزوں کے متعلق لوگ بہت احتیاط سے کام لیا کرتے ہیں۔ بحث و مباحثہ کرنا یقینی اچھا ہے مگر اس سے زیادہ خاموشی بہتر ثابت ہوتی ہے۔ اس وجہ سے کہ بعض وقت وہ اسے محجوب کر دیا کرتی ہے۔ گفتگو کی درازی گفتگو کرنے والے اور سننے والے کے درمیان خیالات کا فرق ظاہر کرتی ہے۔ اگر سننے والا کسی بات کو پہلے سے سمجھے ہوئے ہوتا تو اس کے لئے الفاظ کی ضرورت نہ ہوتی۔ اور اگر وہ ہر اعتبار سے ہم خیال ہوتے

توپھر الفاظ کو تکلیف دینے کی ضرورت نہ ہوتی۔

علم ادب ایک ایسا نقطہ ہے جو ہمارے روزانہ طرزِ زندگی کے
دائرے کے باہر واقع ہے اور اس میں سے ہم ایک اور نیا دائرہ کھینچ
سکتے ہیں۔ علوم و فنون حاصل کرنے کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ہم ایسے
بلند مقام پر پہنچ جائیں جہاں سے ہم اپنی زندگی پر ناقدانہ نظر ڈال سکیں
یعنی یہ کہ علم ایسے طریقے سے حاصل کریں کہ اس کو پھیلا سکیں۔ ہم یونانی
تحقیق اور روم کے پرانے تمدن کی بہترین چیزوں کو اس لئے اخذ
کرتے ہیں کہ ہم فرانسیسی، انگریزی اور امریکائی تمدن کا نہایت بہتر
طریقے سے معائنہ کر سکیں۔ اس طرح ادبیات کا سب سے بہتر منظر
اس وقت نظر آتا ہے جبکہ ہم اپنے آپ کو بدوی حالت یا کاروبار کے
ہنگامے میں فرض کریں یا یہ کہ مذہب کے بلند نقطے سے اس کا معائنہ
کریں۔ اس لئے کہ اس کھیت کو ہم کھیت کے اندر سے نہیں دیکھ سکتے
کوئی نجومی اگر ستاروں کا باہمی فاصلہ معلوم کرنا چاہتا ہے تو اس کو پہلے
مدارِ زمین کا خط معین کرنا چاہیئے۔

یہ وجوہ ہیں کہ ہم شاعر کو قابلِ قدر سمجھتے ہیں۔ تمام دلائل اور ساری

واقعاتی نہ انسائیکلوپیڈیا میں پائی جاتی ہے نہ الہیات کی کتاب میں بلکہ یہ باتیں نظم اور ڈرامے میں پائی جاتی ہیں۔ اپنے روزمرہ کے کام میں میرا رجحان اس طرف ہوتا ہے کہ میں پرانی لکیر کا فقیر بنا رہوں اور میری نظر اس کام کے اصلاحی اسباب پر نہیں ہوتی یعنی یہ کہ اس میں کوئی تبدیلی یا اصلاح کی جائے۔ مگر جو کوئی پیٹر لک یا ادیب ہے تو جب اس کے دماغ میں پُر زور سے نئے خیالات پیدا ہوتے ہیں ہمارے لئے جرأت دلانے والے اور کام میں سرگرمی دکھانے والے اشعار یا جوش سے بھری ہوئی کوئی نظم یا پھڑکتا ہوا کوئی قصہ لکھ دیتا ہے وہ اپنے پُر زور لہجے میں غیرت دلا کے مجھکو بیدار کرتا ہے اور میری عادتوں کی زنجیروں کو توڑ دیتا ہے اور پھر میں آنکھیں کھول کر ترقی کے لئے اپنی امکانی قوتوں کو دیکھتا ہوں۔ وہ اپنے بازو پھڑپھڑاتا ہے۔ اور دنیا کی جمود و کاہلی کو جھنجھوڑتا ہے اور پھر میں دوبارہ اس قابل ہو جاتا ہوں کہ عملی اور نظری طریقے سے راہ راست کو اختیار کروں۔

دنیا کو ہم مرکز دائروں کا ایک نظام تصور کر سکتے ہیں اور کبھی کبھی جب ہم عالم فطرت میں ذرا سا بھی تغیر دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہو جاتا

ہے کہ جس سطح پر ہم کھڑے ہوئے ہیں وہ مستقل اور پائدار نہیں ہے بلکہ پھسلواں ہے۔ یہ طرح طرح کے پائدار خواص یعنی کیمیا، نباتات اور جانوروں کی نسبت ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ بذات موجود ہیں مگر حق تو یہ ہے کہ محض ذرائع اور طریقے ہیں۔ یہ حقیقت میں سب کلمات اللہ ہیں اور اپنی شان کے اعتبار سے ایسے رفتنی و گزشتنی ہیں جیسے اور الفاظ ہوا کرتے ہیں۔ کیا کوئی طبیب یا کیمیاگر یہ دعوی کرسکتا ہے کہ اس نے اپنے فن میں عبارت کو اصلاح کرلیا ہے یعنی یہ کہ اس نے زراعت کی کشش اور ان کے بادی تجاذب تعلق کو دریافت کرلیا ہے مگر حق تو یہ ہے کہ ابتک اس نے اس سے زیادہ اس پُرمعنی اور روحانی قانون کو دریافت نہیں کیا ہے جس کا یہ جزوی اظہار ہے یعنی یہ کہ میل ہم جنسی اور یہ کہ جو باتیں تمھارے لئے مقدر ہوچکی ہیں وہ ہر پھر کے تمھارے پاس آجائیں گی اور اس کے لئے تمھیں کسی قسم کی تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہ ہوگی؟ مگر یہ قانون بھی محض ایک تخمینی حیثیت رکھتا ہے، آخری نہیں ہے۔ موجودیت حق ایک بیّن حقیقت ہے۔ ہر جزو کا اتصال اپنے کل کے ساتھ ملا وابستہ ہے۔ بلکہ اگر غور سے نگاہ ہو

سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ اس بات کا انحصار روح کی مسلسل ترقی پر ہے۔ صحت اور معقول زندگی اسی ترقی کے دو پہلو ہوا کرتی ہیں۔

اسی طرح عالم کے دوامی ترقی کے اسی قانون میں بھی تمام فضیلتیں داخل ہیں۔ چنانچہ اسی قانون کی رو سے جب کوئی نیکی بڑھ جاتی ہے تو اس سے پہلے والی نیکی کے مقابلہ میں ناقص بنا کرتی ہے بڑے آدمی کو ضرور بہت محتاط بنیں کہنے اس کی تمام احتیاطیں اس کی عظمت کو نقصان پہنچایا کرتی ہیں۔ مگر تنہا شخص کو دیکھنا چاہئے کہ جب وہ دانائی کو چھوڑ دیتا ہے تو پھر کس نئے سعید کی طرف جاتا ہے۔ اگر اس کی احتیاط سہل انکاری اور مسرت کے دربار میں مقبول ہو تو اس صورت میں اس کو چاہئے کہ ابھی اور احتیاط سے کام لے۔ اگر وہ زیادہ احتیاط کے لئے مقبول ہوئی ہے تو اس کو چاہئے کہ اس قسم کی جلد بازی نہ کرے۔ جانور جنگل میں جاتے وقت اونچے بوٹ پہن لیتا ہے تاکہ سانپ کے کاٹنے سے محفوظ رہ سکے۔ مگر ایرو ات کو اس قسم کے خطرات کی پروا بھی نہیں ہوتی۔ مدتوں سے وہ اس قسم کے خطرات میں مبتلا بھی نہیں ہوا۔ تاہم مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے خطرات کو

خلاف جو احتیاط تم برتا کرتے ہو، تو حقیقت میں اس احتیاط سے گویا اپنے آپ کو خطرات کے حوالے کر دیا کرتے ہو۔ میرے خیال میں زیادہ سے زیادہ احتیاط کم سے کم ہوا کرتی ہے۔ ایسا کرنا گویا مرکز سے ایکدم کود کر کنارے پر آجانا ہے۔ خیال کرنے کا مقام ہے کہ پیشتر اس کے کہ ہم کسی اچھے مقصود ذہنی کو پوری طرح اختیار کریں یا یہ کہ آج جس مقام پر ہم پہنچ چکے ہیں اس کو اپنے مقاصد کا نیا مرکز بنائیں، ہمیں غور و فکر کی کیسی کیسی کٹھن منزلیں طے کرنی ہونگی۔ علاوہ اس کے جس اعتقاد کو تم بہترین اعتقاد سمجھے ہوئے ہو اس سے ادنیٰ سے ادنیٰ لوگ بھی باخبر ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ غریب اور کمتر آدمی بھی فلسفے کے آخری مسائل کو بیان کرنے کیلئے ایسا ہی طریقہ رکھتے ہیں جو تمھارے پاس ہے۔ "کسی چیز کا نہ ہونا مبارک ہے" اور "بدتر چیزیں بھی جس حال میں ہیں اچھی ہیں" اور حقیقت میں یہ وہ ضرب المثلیں ہیں جو عام زندگی کے بڑے نکات ظاہر کرتی ہیں۔

ایک آدمی کا انصاف دوسرے آدمی کی نا انصافی ہوتی ہے ایک آدمی کی خوبصورتی دوسرے آدمی کی بدصورتی ہوتی ہے۔ ایک

آدمی کی دانشمندی دوسرے آدمی کی حماقت ہوتی ہے' اس وجہ سے کہ ایک شخص بہ نسبت دوسرے شخص کے ایک ہی چیز کو وسیع نظر سے دیکھتا ہے۔ ایک شخص یہ خیال کرتا ہے کہ صرف قرض کا ادا کرنا ہی انصاف ہے اور جب وہ دوسرے آدمی کو نادہندپاتا ہے یعنی جو قرض خواہ کو بیحد انتظار کراتا ہے تو اس کی نفرت کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ لیکن دوسرے شخص کی نظر کچھ اور ہی ہوتی ہے' یعنی یہ کہ وہ اپنے دل سے پوچھتا ہے کہ پہلے کونسا قرضہ ادا کرنا چاہیئے! میرکا یا غریب کا؟ روپیہ کا قرضہ؟ یا انسانوں کو خیالات کا یا فطرت کو فراست کا ہے؟ ولال میرے لئے سوائے حساب کے اور کوئی اصول درحقیقت ہی رہی نہیں۔ میرے لئے تجارت بالکل بے حقیقت چیز ہے' میں محبت' ایمان' سیرت کی صداقت' انسانوں کی بلندخیالی کو قابلِ وقعت سمجھتا ہوں۔ نہ میں تمھاری طرح دوسرے فرایض میں سے کسی فرض کو جدا کرسکتا ہوں اور نہ میں اپنی تمام قوتوں کو محض قرضے کی ادائی کے لئے مجتمع کرسکتا ہوں۔ مجھے جینے تو دو پھر تمھیں معلوم ہوجائے گا' گو ذرا دیر سے! کہ میری سیرت کی ترقی تمام قرضوں کو بیباق کردے گی اور اس سے بھی

زیادہ جو وعدے اور مطالبے مجھ پر ہیں اُن کی ادائی میں بھی کوئی
ناانصافی نہ ہونے پائے گی۔ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو قرضوں کی
بیباقی کے لئے وقف کر دے تو کیا یہ اس کے لئے ناانصافی ہوگی؟
کیا اسے روپیہ ہی کا قرضہ ادا کرنا چاہئے؟ اور کیا اس کے ذمے جو
اور وعدے ہیں وہ ملتوی کر دئے جائیں تاکہ وہ زمینداروں کے
مطالبے اور مہاجنوں کے قرضے ادا کیا کرے؟

کوئی نیکی مختتم نہیں ہوتی بلکہ تمام نیکیاں ابتدائی ہوا کرتی ہیں۔
لوگوں کی نیکیاں ایک ولی کے حق میں برائیاں ہیں (حسناتُ العوام
سیئاتُ الابرار) کسی اصلاح میں اصلی خوف اس انکشاف سے
ہوتا ہے کہ اب ہمیں اپنی نیکیوں سے دست بردار ہونا پڑے گا یا
ان افعال سے جن کو ابتک ہم نیکی سمجھتے رہے اور اب اُن افعال کو
اس گڑھے کی نذر کر دینا پڑے گا جسمیں ہم نے کبیرہ گناہوں کو ڈالدیا تھا۔

اللہ عزوجل کی یاد ایک ایسی زبردست قوت ہوتی ہے جس سے
ہماری پریشانیاں رفع ہوجایا کرتی ہیں۔ میں روز بروز اپنے اوپر یہ
الزام لگایا کرتا ہوں کہ میں سست ہوں اور دنیا میں میرا عدم وجود

برابر ہے لیکن جب وقت ربانی سوچیں میرے اندر موجزن ہوتی ہیں تو اس وقت مجھے ضائع شدہ وقت کا احساس نہیں ہوتا۔ اس وقت میں اپنے کارہائے نمایاں کا تخمینہ کچھ ادنیٰ درجہ کا قرار نہیں دیتا، نہ یہ دیکھتا ہوں کہ اپنے کاموں کو انجام دینے کے لئے اب کتنا وقت باقی رہ گیا ہے۔ یہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس وقت مجھے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اللہ عزوجل حاضر و ناظر ہے اور تمام چیزیں اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور اس کے لئے وقت کی کوئی قید نہیں ہے۔ اور یہ حضوری صرف اس بات کو چاہتی ہے کہ جو کام مجھے کرنا ہے اس کے انجام دینے کے لئے میرے قلب میں استعداد ہے یا نہیں ہے اور اسکے لئے وقت کی کوئی پابندی نہیں ہے۔

یہ سب سن کر ممکن ہے کوئی پکار اُٹھے کہ اے دائرہ پرست فلسفی تم تمام کاموں کو مساوی اور لغو سمجھنے کے اچھے خاصے تذبذب میں مبتلا ہوگئے ہو اور گویا ہمیں یہ سکھانا چاہتے ہو کہ اگر ہم "صادق ہوں" تو ہمارے جرائم بھی ان زندہ پتھروں کی شکل ہو جائینگے جن سے خدائے برتر کا معبد تعمیر کیا جاسکے۔

اس کے جواب میں مجھے کوئی تاویل کرنے کی آرزو نہیں ہے۔ میں
تسلیم کرتا ہوں کہ جس طرح تمام عالم نباتات میں شکر کا جزو غالب دیکھکر
مجھے خوشی ہوتی ہے اسی طرح یہ دیکھکر میں کچھ کم مسرور نہیں ہوتا کہ ہر
شگاف و روزن میں جیسے خود غرضی نے کاٹ کر بنایا ہے حتیٰ کہ
اس خود غرضی اور گناہ کی ذات میں بھی نیکی کا جزو بے روک سیلاب
کی طرح موجزن ہے چنانچہ کوئی بدی خالص بدی نہیں ہے اور خود
دوزخ بھی انتہائی راحت کے عنصر سے مبرا نہیں ہے۔ لیکن کہیں
ایسا نہ ہو کہ میں اپنے خیال اور وہم پرستیوں سے کسی کو گمراہ کردوں
اس وجہ سے مجھے ناظرین کو متوجہ کردینا چاہئے کہ میں صرف تجربہ
کرنے والوں میں ہوں۔ جو کچھ میں کہتا ہوں اس کی ذرا بھی قدر نہ کرو
اور جو کچھ میں نہ کروں اس کو بھی میرا نقص نہ سمجھو بلکہ اس کے متعلق یہ سمجھو
کہ گویا میں کسی چیز کی صحت یا عدم صحت کے متعلق کوئی دعویٰ ہی نہیں
کرتا۔ میں تمام چیزوں کو غیر فیصل شدہ قرار دیتا ہوں۔ میرے نزدیک
نہ کوئی واقعہ قابل وقعت ہے نہ کوئی قابل نفرت۔ میں محض تجربہ کرتا
ہوں مگر بڑا متجسس ہوں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ گویا گذشتہ واقعات میرے

پاس موجود ہی نہیں ہیں۔

تاہم تمام چیزوں کی مسلسل حرکت اور ترقی کے بارے میں ہم اس وقت تک مطلق نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ ہم ان کا روح کے کسی مستقل اور باثبات اصول سے مقابلہ نہ کریں۔ جبکہ دائروں کی ازلی پیدائش جاری ہے، ازلی پیدا کنندہ بھی موجود ہے۔ یہ اصلی زندگی مخلوقات سے کچھ نہ کچھ افضل ہے یعنی وہ علم اور خیال سے افضل ہے اور اپنے تمام دوائر پر مشتمل ہے۔ وہ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتی ہے کہ ایسی زندگی اور خیال پیدا کرے جو اتنی ہی وسیع اور اعلیٰ ہو جیسی کہ وہ خود ہے۔ لیکن یہ کوشش رائیگاں ہے اس وجہ سے کہ جو چیز بن گئی ہو اس سے یہ ہدایت ملتی ہے کہ اس سے بہتر کیونکر بنائی جائے۔

پس عالم فطرت میں نہ غنید کی کوئی حقیقت ہے نہ توقف کی، اور نہ فطرت کسی چیز کو باقی رکھتی ہے بلکہ تمام چیزیں از سر نو پیدا ہوتی ہیں، اُگتی ہیں اور پھلتی پھولتی ہیں۔ تو پھر اس صورت میں ہم اس نئے لمحہ میں پرانی نشانیوں کا کیوں ذکر کریں؟ اس وجہ سے کہ فطرت کو قدامت سے نفرت ہے اور پیری وصد عیب کا واقعہ مشہور بھی ہے

اور حق تو یہ ہے کہ تمام بیماریوں کا انجام یہ ہی ہے۔ ہم نے اس کے بہت سے نام رکھ لیے ہیں مثلاً بخار، مزاج کا بگاڑ، دیوانگی، بے ترتیبی اور جسم یہ سب بڑھاپے کی نشانیاں ہیں، ان کو تم سکون، کون، و فساد، حفاظت اور جبر وغیرہ سے موسوم کیا کرتے ہو۔ یہ حقیقت میں جدت نہیں ہے اور نہ یہ کوئی ترقی کا طریقہ ہے۔ ہم انھیں باتوں کے متعلق روزانہ شکوے شکایات کیا کرتے ہیں۔ مگر میں اس کی کوئی ضرورت نہیں پاتا۔ اس وجہ سے کہ جب ہم خدا کی ستائش میں مصروف ہو جاتے ہیں تو اس وقت ہم پر ضعف طاری نہیں ہوتا بلکہ ہم جوان ہو جاتے ہیں۔ بچپن اور جوانی میں لوگوں کی طبیعتوں میں ایک قسم کی قبولیت کا مادہ ہوتا ہے اور وہ ہر چیز کو بلند خیالی اور مذہبی نظر سے دیکھا کرتے ہیں۔ اس عالم میں یہ لوگ اپنے آپ کو ناچیز سمجھا کرتے ہیں اور عالم کائنات میں ہر طرف سے جو انھیں نصیحت ملا کرتی ہے اس پر عمل پیرا ہونے کیلئے خود کو وقف کر دیتے ہیں۔ لیکن وہ نفوس جن کی عمر ستر برس سے متجاوز ہو چکی ہو، خواہ وہ مرد ہوں، یا عورت، ان کا یہ خیال ہوتا ہے کہ ان کو سب کچھ آتا ہے۔ ان کی نسبت لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں اپنی

تمام آرزوئیں نکال چکے ہیں۔ بلند خیالی ان سے رخصت ہو جاتی ہے،
حسبِ ضرورت جو باتیں حاصل کر لینا چاہیئے، وہ ان کو منظور کر لیتے ہیں
اور نوجوانوں کو ان کے متعلق ہدایتیں کیا کرتے ہیں۔ اس حالت میں
ان کو چاہیئے کہ وہ اللہ عزوجل کے ہو رہیں اور اسی کی یاد میں محو رہیں
اور پھر نئی نئی ہدایتوں کو دیکھیں۔ پھر اس صورت میں ان کی آنکھیں
کھل جاتی ہیں، وہ بڈھے نہیں رہتے یعنی پھر ان میں امیدوں اور
قوت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ مگر انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنے دل میں
کم ہمتی کے خیال کو آنے بھی نہ دے۔ اس وجہ سے کہ عالمِ فطرت میں
ہر لمحہ نیا ہوتا ہے۔ زمانہ گذشتہ قابلِ فراموش ہوتا ہے صرف آنے والا
زمانہ ہی مقدس مانا جاتا ہے۔ کوئی چیز سوائے عمرِ رواں کے محفوظ
نہیں ہے۔ یہی تغیر ہے اور یہی قوت بخش روح ہے۔ کوئی محبت
عہد و پیمان اور قول و قرار سے مستحکم نہیں ہو سکتی یعنی یہ عہد و پیمان اس
سے بالاتر محبت کے لئے رکاوٹ نہیں ہو سکتا۔ کیسا ہی صداقت کا
بلند خیال ہو مگر وہ کل نئے خیالات کے آگے کچھ بھی نہ رہے گا۔ انسان
کو یہ تمنا ہوا کرتی ہے کہ انھیں سکونِ قلب نصیب ہو مگر اس صورت

میں بھی وہ اپنے آپ کو غیر مطمئن پاتے ہیں پھر اُن کے لئے کیا اُمید ہو سکتی ہے۔

زندگی عجائبات کا ایک سلسلہ ہے۔ جب ہماری زندگی مُسلسل ترقی کر رہی ہے تو اس صورت میں بھی آج کون شخص یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ کل ہم کونسا انداز اختیار کریں گے یا ہم کو کل کونسی خوشی نصیب ہونے والی ہے یا یہ کہ ہم کو کل کونسی قوت میسر ہوگی۔ روزمرّہ کے معمولی اور حواس ظاہری کے کام یعنی ادنیٰ کیفیات کے متعلق تو ہم کچھ نہ کچھ کہہ بھی سکتے ہیں۔ لیکن اللہ عزوجل کے اعلیٰ افعال روح کی ہمہ گیر حرکات اور کلی نشوونما کے راز پوشیدہ ہیں اور علم و قیاس میں بھی نہیں آ سکتے۔ میں اس بات کو جان سکتا ہوں کہ صداقت خدا کی طرف سے ہوا کرتی ہے اور اس سے ہم کو مدد بھی ملتی ہے لیکن مجھے اس کا اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ میری مدد کیسے کریگی کیونکہ اس کا واحد ذریعہ اس علم کے مطابق حال کا ہو جانا ہے۔ اِنسان جب ترقی کر کے اس حالت پر آجاتا ہے تو اس حالت میں اسمیں قدامت کی تمام قوتیں پائی جاتی ہیں۔ مگر یہ قوتیں بہرحال اسکے لئے نئی ہو جا

ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اس میں تمام گذشتہ قوتیں موجود رہتی ہیں مگر خود اس کی کیا حالت ہوتی ہے۔ یعنی حقیقت میں وہ نسیم سحری کا ایک جھونکا ہوتا ہے۔ جب مجھے یہی حالت نصیب ہو جاتی ہے تو اس لمحہ میں میں اپنا تمام علمی ذخیرہ بے کار پاتا ہوں، اس وجہ سے کہ اب مجھے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ حقیقت میں کوئی بات ٹھیک ٹھیک معلوم ہوئی ہے معمولی سے معمولی الفاظ کے معنی ہیں اس وقت صحیح معنوں میں معلوم ہوتے ہیں جب ہم میں محبت اور بلند خیالی کا جذبہ پایا جائے بجز اس صورت کے ہم انکے معنی نہیں سمجھ سکتے۔

اچھی قابلیت اور اچھی خصلت میں یہ فرق ہے کہ اچھی قابلیت والا تو قدیم اور کھوندی ہوئی راہ کو یاد رکھتا ہے اور اچھی خصلت والا یہ قوت اور ہمت رکھتا ہے کہ نئے اور بہتر مقاصد کے لئے خود ایک نئی راہ بنائے اس وجہ سے کہ خصلت ایک مرعوب کن ہارہ ہے، وہ ایک اطمینان اور خوش وقتی کا سماں ہے جو ساری سبھا کی ہمت کو یہ دکھا کر مضبوط کر دیتا ہے کہ ایسا بہت کچھ ممکن اور بہت خوب حاصل ہو سکتا ہے جس کا پہلے خیال بھی نہ تھا۔ حقیقت میں خصلتِ انسانی خاص خاص

واقعات کے اثر کو کمزور کر دیا کرتی ہے۔ چنانچہ جب ہم کسی فاتح کو دیکھتے ہیں تو اس کو دیکھ کر ہم یہ خیال نہیں کرتے کہ اس نے کوئی لڑائی جیتی ہے یا یہ کہ اس نے کسی جنگ میں کامیابی حاصل کی ہے بلکہ ہمیں یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم نے خود مشکلات کو بڑھا دیا تھا جس کو اس نے آسان کر دیا۔ بڑے آدمی میں کوئی تغیر یا تبدیلی پیدا نہیں ہوتی، بلکہ واقعات اس کے اوپر بغیر کسی اثر کے گذر جایا کرتے ہیں۔ چنانچہ لوگ اکثر کہا کرتے ہیں کہ "دیکھو! میں کس مشکل پر غالب آیا۔ دیکھو! میں کیسا خوش ہوں۔ دیکھو! میں ان سخت مشکل کاموں کا مقابلہ کرکے کیسے کامیاب ہوا۔" حقیقت میں یہ بالکل بے کار سی بات ہے کہ اگر لوگ مجھے سخت مصیبت کے واقعات کی اب بھی یاد دلائیں اس وجہ سے کہ حقیقی کامیابی اسی میں ہے کہ مشکلات کو اس طرح محو اور معدوم کیا جائے جس طرح ایک وسیع اور ترقی پذیر تاریخ میں کوئی ابتدائی حادثہ جس کا نتیجہ پوری سرگذشت کے مقابلے میں ہیچ ہوا۔

ایک چیز جس کی ہمیں بیحد آرزو رہتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو بالکل بھول جائیں یعنی یہ کہ ہم اپنی خصوصیت پر خود چونک پڑیں یعنی

ہم اپنی کبھی نہ بھولنے والی یاد کو مطلق فراموش کر دیں اور کوئی ایسا کام
کریں جس کے متعلق ہمارا یہ خیال ہو کہ یہ کام کیسے اور کیونکر ہوتا۔ مختصر
یعنی ایک نیا دائرہ بنائیں۔ اس وجہ سے کہ کوئی کام بغیر سرگرمی کے
نہیں ہوا ہے۔ زندگی کا راستہ عجیب و غریب باتوں سے بھرا ہوا ہے اور
وہ ناخواستہ نصیب ہوا کرتی ہیں۔ تاریخ کے بڑے بڑے واقعات
عقل کے زور سے بسہولت انجام پا گئے ہیں مثلاً فراست اور مذہب
کے کام۔ الائیور کروم ویل کا قول ہے کہ وہ کسی شخص کو اس وقت بڑا مرتبہ
نصیب ہوتا ہے جب اس کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کہاں تک جا رہا ہے"
خواب اور بدہوشی یا افیون اور شراب کا استعمال گویا یہ کیفیات بلند
خیالی کا چھوٹا بدل ہیں اور اسی لئے ان میں ایسی خطرناک کشش پنہاں
ہے۔ اسی بنا پر لوگ اپنے قلب کے فیاضانہ جذبات اور حوصلہ مندیوں
کا ارمان نکالنے کے لئے جنگ اور شکار کے مشاغل سے اپنا جوش طبعی
بجھانا چاہتے ہیں۔ فقط

بشاشت

از مسٹر ایڈیسن

میں ہمیشہ خوشی پر بشاشت کو ترجیح دیتا ہوں۔ میں اوّل الذکر کو ایک فعل اور موخر الذکر کو خصلت طبعی خیال کرتا ہوں۔ خوشی ایک فعل ہوتا ہے اور بشاشت مستقل اور دائمی ہوتی ہے۔ جن لوگوں کو اکثر انتہائی خوشی ہوتی ہے انھیں لوگوں کو اسی نسبت سے غم میں بھی مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ برخلاف اس کے بشاش رہنے سے گو ہم کو وہ بات نصیب نہیں ہوتی جو خوشی سے حاصل ہوتی ہے مگر ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہم غم کے گڑھے میں گرنے سے بچ جاتے ہیں۔ خوشی بجلی کی چمک کے مانند ہوتی ہے جو ذرا سی دیر کے لئے بادلوں میں چمک کر غائب ہو جاتی ہے۔ بشاش رہنے سے دماغ

میں ایک قسم کی پائدار روشنی قایم رہتی ہے اور ہم مستعد اور ہمیشہ متین رہتے ہیں۔

وہ لوگ جو اصولوں کی سختی سے پابندی کرتے ہیں خوشی کو آزمایش کی حالت کا سخت ترین موقع سمجھتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ خوشی کیوقت انسان کے دل میں ایک قسم کا جوش اور ایک خاص قسم کی شوخی پیدا ہو جاتی ہے اس لئے یہ حالت زندگی کی اس حالت سے مختلف ہوتی ہے جس میں ہر لحہ بڑے سے بڑے خطرہ میں مبتلا ہو جانیکا خدشہ لگا رہتا ہے۔ بشاش رہنے کے لئے ان اقسام کی ذمہ داریوں میں سے کوئی استثنا نہیں ہے۔ یہ سنجیدگی اور اطمینان کی قسموں میں سے ایک قسم ہے یہ طبیعت کو انسانیت کی موجودہ اطمینانی حالت سے نامناسب حالت کی طرف بھٹکنے نہیں دیتی اور ان لوگوں کے کیریکٹروں میں یہہ ایک ضروری چیز سمجھی جاتی ہے، جو بُت پرستوں میں فیلسوف مانے جاتے ہیں اور ان لوگوں کیلئے بھی یہ ایک معروف چیز ہے جنھوں نے عیسائیت میں بزرگی اور پارسائی کا رتبہ پایا ہے۔

اگر ہم بشاش رہنے کے مسئلہ پر تین نسبتوں سے غور کریں یعنی

اپنی نسبت' دوسروں کی نسبت جن سے ہم بات چیت کرتے ہیں اور اللہ عزوجل کی نسبت تو یہ مسئلہ ان تین نسبتوں میں سے ہر ایک پر پورا اترتا ہے - ایک شخص جس کو اعلیٰ درجہ کی طبیعت عطا ہوئی ہے اسکے خیالات صرف اعلیٰ ہی نہیں ہوتے بلکہ اس کو روح کے تمام شعبوں کی قوتوں پر کامل قدرت حاصل ہوتی ہے' اس کا تخیل سلجھا ہوا ہوتا ہے' اور اس کا فیصلہ ناقابل تنسیخ - اس کے مزاج میں یکسانیت اور توازن پایا جاتا ہے - یہ سب باتیں اس میں ہر وقت پائی جاتی ہیں' خواہ وہ مصروف ہو یا تنہا - قدرت نے جو نیک کام اس کیلئے بنائے ہیں وہ ان کو ضرور کرتا ہے' ہر جائز خوشی سے فائدہ اٹھاتا ہے اور ان غموں سے جن میں اتفاقی طور پر وہ مبتلا ہو جاتا ہے اپنے آپکو زیادہ متاثر نہیں ہونے دیتا -

اگر ہم اس شخص کو ان لوگوں کے زمرہ میں شمار کریں جن سے وہ بات چیت کرتا ہے تو معلوم ہوگا کہ اس سے لوگوں کو قدرتی محبت پیدا ہو جاتی ہے اور لوگ اس کی نسبت اچھی رائے قایم کرتے ہیں بشاشت رہنے والا شخص صرف صاحب مروت اور ممنون ہونے والا ہی نہیں

ہوتا بلکہ جن لوگوں سے وہ گفتگو کرتا ہے ان کو بھی اپنا ہی جیسا بنا لیتا ہے۔
ایک شخص اپنے آپ کو بہت خوش پاتا ہے، اسے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ
اس کا سبب کیا ہے مگر اس کا سبب اس کے ساتھی کا بشاش رہنا ہے۔
بشاشت ایک قسم کی اچانک روشنی ہوتی ہے جو طبیعت میں پوشیدہ
خوشی کو نامعلوم طریقے سے پیدا کر دیتی ہے، دل خود بخود خوشی سے لبریز
ہو جاتا ہے اور قدرتی طور سے دوستی اور خیر خواہی کے لئے ان لوگوں کی
طرف بڑھتا ہے جنھوں نے اس پر ایسا اثر ڈالا ہو۔
جب میں بشاش رہنے کے منافع کی تیسری نسبت پر غور کرتا ہوں
تو دل یہ چاہتا ہے کہ میں قدرت کی مسلسل شکر گزاری میں جیسا کہ کرنا
چاہئے مصروف ہوں۔ اندرونی طور سے بشاش رہنا ہی قدرت کی
مکمل عبادت اور شکر گزاری میں داخل ہے۔ ہم کسی حالت میں بھی ہوں لیکن
مگر اس سے ایک قسم کی تسلیم و رضا ظاہر ہوتی ہے اور اس طریقے سے
گویا انسان پوشیدہ طور سے قدرت کی رضا جوئی کرتا رہتا ہے۔
میری رائے میں صرف دو چیزیں ایسی ہیں جو یقیناً ہم کو بشاش
رہنے سے محروم کر دیتی ہیں، ان میں سے ایک گناہ کی طرف مائل

ہوتا ہے۔ وہ شخص جس کا میلان بدی کی طرف ہوتا ہے اُسکو سکون اور اطمینانِ قلب نصیب نہیں ہوتا جس پر روح کی صحت کا انحصار ہے اور جو نیکی اور معصومیت کا قدرتی وسیلہ ہے۔ بدکار آدمی سے بشاشت کوسوں دور رہتی ہے۔ اگر بدکار آدمی کے لئے بشاشت کی مرادف کوئی لفظ زبان میں ڈھونڈا جائے تو نہیں مِلسکتا بلکہ ایسا لفظ تلاش کرنا چاہیئے جو سینکڑوں درجہ حماقت یا دیوانگی سے بڑھا چڑھا ہو۔

دہریت یعنی خدا کی ہستی سے انکار کرنا۔ یہ بات بھی ایسی ہے جس سے انسان بشاش رہنے سے بالکل محروم ہو جاتا ہے۔ خدا کی ہستی کو نہ ماننا فطرتِ انسانی کے لئے ایک خاص قسم کا سخت ترین جرم ہے جس کی تشریح ناممکن ہے۔ بلکہ حیرت ہوتی ہے کہ بعض بڑے بڑے سمجھدار لوگوں کے دل میں اس قسم کے خیالات کیونکر پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ خدا کی ہستی ایک ایسی ہستی ہے جس کے متعلق ذرا بھی شک و شبہ کی گنجایش نہیں ہے اور صرف یہ ہی ایک ایسی برحق ہستی ہے جس پر ہمکو یقین واثق رکھنا چاہیئے۔ یہ ہی حقیقت میں وہ ہستی ہے جس کا پرتو ہم ہر چیز میں ہر واقعہ

میں اور ہر خیال میں پاتے ہیں۔ اگر ہم خدا کی ہستی سے انکار کرنے والے گروہ کے ہر فرد کے کیریکٹر کو غور بین نگاہوں سے دیکھیں تو ہم کو معلوم ہو جائیگا کہ ہر شخص غرور، غصہ اور بات بات پر نکتہ چینی کے خمیر سے بنا ہوا ہے۔ دراصل یہ تعجب کی بات نہیں ہے۔ اگر لوگ کسی قسم کی اندرونی بے چینی رکھتے ہوں تو ایسا دوسروں کے ساتھ کیوں ہو؟ اور ایسے شخص کے لئے جس کی ہستی ہر وقت خطرے میں رہتی ہے، یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ خود اسقدر بے چین نہ ہو؟ ایسے شخص سے کسی کو کوئی نفع بھی نہیں پہنچتا۔

بدکار اور خدا کی ہستی کے منکر اگر بشاش رہنے کے لئے نامعقول جدوجہد بھی کریں تو یقین مانئے کہ ان کو اس کا شائبہ تک نصیب نہیں ہو سکتا۔ وہ لوگ جو اسی سبب سے عذاب، بربادی اور بدبختی میں مبتلا رہتے ہیں اُن کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ کسی حالت میں خوش رہ سکیں، اور دنیا کی لذتوں سے فائدہ اُٹھا سکیں۔

دو بڑے اصول جو بیان کئے گئے ہیں یہ فطرتاً اور اصولاً بشاش رہنے کے منافی ہیں۔ ان کے بعد میں کسی اور دوسری چیز کو اُن کے مماثل نہیں سمجھتا جو بدکار آدمی کے دل سے اس عجیب غریب چیز کو نکال

سکیں۔ دکھ درد، شرم، ملامت، افلاس اور حقیقی بیماری نہیں بلکہ موت کا بھی اگر خیال کیا جائے اور ان سب چیزوں کے قیام کے اختصار پر غور کیا جائے اور ان سے جو نفع یا نقصان پیدا ہوتا ہے اس پر بھی ایک نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ یہ سب چیزیں بھی برائی کے نام سے موسوم کئے جانے کی مستحق نہیں ہو سکتیں۔ اچھی سمجھ رکھنے والا آدمی ان سب باتوں کو صبر و شکر، حلم و بردباری سے اور ہشاش بشاش رہ کر برداشت کریگا۔ سمندر کا خطرناک طوفان بھی اس کو مایوس نہیں کر سکتا اس وجہ سے کہ وہ جہاز میں اطمینان سے بیٹھا رہو ایک خوشگوار بندرگاہ پر پہونچنے کے لئے قدرت سے لو لگائے ہوئے ہے اور اس کیساتھ یقین کامل بھی رکھتا ہے۔

ایک شخص جو قدرت کی مشیت پر صحیح اصولوں پر کاربند رہکر چلتا ہے اس کے لئے بشاش رہنے کے دو دائمی ذرایع اپنی آغوش کھولے رہتے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ وہ اپنی ناچیز ہستی پر غور و خوض کرتا رہے اور دوسرے یہ کہ اللہ عزوجل کی عبودیت کا ہر حالت میں اقرار کرتا رہے اگر اپنی ہستی پر غور کیا جائے تو ہم کو اس بات سے حقیقی مسرت ہوگی کہ

جو ہستی قدرت نے ہم کو عطا کی ہے وہ لاتعداد ہستیوں کے گزر جانے کے بعد نصیب ہوئی ایک نئی ہستی ہے جب اس کی ابتدا اور انتہا پر غور کیا جاتا ہے اور دوسرے شعبوں پر نظر غائر ڈالی جاتی ہے کہ اپنی ابتدا سے چند ہی سال میں انھوں نے کس قدر حیرت انگیز ترقی کی ہے اور یہ ترقی ان شعبوں کی تکمیل کا باعث ہوگی اور اس تکمیل سے خوشیوں میں اضافہ ہوگا تو خدا کی شکر گزاری اور اپنے لئے مبارکباد کے بے انتہا جذبات دل میں خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ راست باز آدمی کو اس قسم کے خیال ہی سے دائمی روحی مسرت ہوتی ہے اور یہ باتیں اس کو ہر لمحہ خوش وخرم رکھتی ہیں، مگر اس کو یہ علم ہونے نہیں پاتا کہ وہ کیوں اس قدر خوش وخرم رہتا ہے۔

سمجھدار آدمی کے لئے بشاش رہنے کا دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ اللہ عزوجل کا خیال دل میں رکھے، یہ وہ بزرگ و برتر ہستی ہے جس کی صرف ادنیٰ سی جھلک کا گو دنیا و مافیہا ایک کرشمہ ہے اور یہ آدمی کے نزدیک ایک معمولی بات ہے، مگر ہم کو یہ سب باتیں کس قدر شاندار پر شوکت اور پر عظمت معلوم ہوتی ہیں۔ خالق اکبر ہم کو ہر جگہ اپنی عنایتوں سے سرفراز کرتا رہتا ہے

اور یہی چاہتا ہے کہ ہم کو ہر طریقے سے خوش و خرم رکھے اور اُس کی برتری سچائی اور مشیت یہی چاہتی رہتی ہے کہ ان لوگوں کو جو اُس سے نیکی کی توفیق چاہتے ہیں ہمیشہ شادان و فرحاں رکھے۔

یہاں تک جو بیان ہوا ہے اس میں بشاشت کے متعلق انسان کی طبعی خصلت پر غور کیا گیا ہے اور ساتھ ہی اس کے ایسے اسباب بیان کئے گئے ہیں جن پر انسان اگر کاربند رہے تو ہشاش بشاش رہکر اپنی روح کو تر و تازہ اور زندہ رکھ سکتا ہے۔ اچھا آؤ اب بشاشت کی فطری حالت پر غور کریں اور ان اسباب پر روشنی ڈالیں جن کا اچھائی برائی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

بشاشت کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ انسان کی صحت کو ترقی دیتی ہے برخلاف اس کے کُڑھن اور اندرونی رنج و غم دل و دماغ کے اعضائے رئیسہ کے ریشوں کو نامعلوم طریقے سے صدمہ پہنچاتے رہتے ہیں اور اس صدمہ سے جسم کی مشین کو بتدریج نقصان پہنچتا رہتا ہے اس کے علاوہ ان چیزوں سے خون میں ایک قسم کا تلاطم اور حیوانی جذبات میں جو رکاوٹیں پیدا ہوتی رہتی ہیں ان کا ذکر کرنا ہی فضول

ہے۔ میری نظر سے شاذ و نادر ہی کوئی ایسا بڈھا آدمی گزرا ہوگا جس کے چہرہ پر بشاشت ہو اور طبیعت میں کسی حد تک لاپروائی سی نہ ہو یعنی اگر اس میں بشاشت نہ ہوگی تو کم از کم اس کی طبیعت میں لاپروائی تو ضرور ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ صحت اور بشاشت اس فرق کے ساتھ ایک دوسرے سے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اگر ہم بشاش نہ رہتے ہوں تو ہمکو اچھی صحت کا درجہ شاذ ہی نصیب ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم بیشتر یہ دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں کی صحت اچھے حال میں نہیں ہوتی وہ بھی اکثر بشاش بشاش رہتے ہیں۔

بشاشت کا جیسا گہرا تعلق جسم سے ہے ویسا ہی طبیعت سے بھی ہے۔ یہ تمام تفکرات اور پریشانیوں کو رفع کرتی ہے، غصے کے جذبات کو ٹھنڈا کرتی ہے اور روح کو دائمی حالت سکون میں رکھتی ہی۔ لیکن اس آخری خیال کے متعلق کہنے سے پہلے میں یہ کہونگا کہ جب دنیا میں ہم پیدا کئے گئے ہیں اس میں ایسی چیزیں بیشمار موجود ہیں جن سے ہم اپنی طبیعت کو خوش و خرم رکھ سکتے ہیں۔

اگر ہم خیال کریں کہ دنیا انسان کے قبضہ میں ہے تو یقینی یہ خیال

ہوگا کہ دنیا ہمارے ہی واسطے بنائی گئی ہے۔ اگر ہم اس کی قدرتی خوبصورتی
اور عجیب چیزوں کے متعلق خیال کریں تو ہم اس سے یہ نتیجہ نکالیں گے کہ دنیا
ہمارے عیش و آرام کے لیے بنائی گئی ہے۔ سورج جو دنیا کی سب
بڑی جاندار شے ہے ہماری زندگی کے لیے ہر قسم کی ضروری چیزیں مہیا
کرتا ہے اور یہ انسان کی طبیعت کو بشاش رکھنے اور دل کو خوش رکھنے
کا ایک خاص ذریعہ ہے۔

وہ مختلف جانور جو دنیا میں پیدا کیے گئے ہیں جن سے ہماری
پرورش بھی ہوتی ہے اور ساتھ ہی اس کے ان کے خوش کن نغموں
سے جنگل گونجتے رہتے ہیں۔ ان نغموں سے ہمارے دل میں ایک قسم کی
خوشی پیدا ہو جاتی ہے اور ان کو دیکھ کر ہماری طبیعت بیحد مسرور بھی
ہوتی ہے۔ چشمے دریا اور جھیلوں کے منظر سے طبیعت میں ایک قسم
کی ایسی تازگی پیدا ہو جاتی ہے جیسی زمین کے ان حصوں کو دیکھنے سے
جن پر وہ بہتے ہیں۔

بڑے بڑے مبصروں نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ تمام دنیا
نسبت اور رنگوں کے سبز رنگ سے بھری ہوئی ہے اور سبز رنگ

روشنی اور سایہ کا ایسا امتزاج ہے جس سے بصارت کو کسی قسم کا نقصان یا کمزوری پہونچنے کی بجائے اس کو آرام اور تقویت پہنچتی ہے اسی وجہ سے بہت سے مصور اپنی آنکھوں کے سامنے سبز کپڑا لٹکائے رہتے ہیں جس سے ان کی بینائی کو خواہ وہ اپنے فن میں کتنی ہی محنت کیوں نہ کریں کوئی نقصان نہیں پہنچتا - سر اڈاک نیوٹن نے اس کے وجوہ جو بیان کئے ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں :-

"تمام رنگ جو زیادہ شوخ ہوتے ہیں وہ ان حیوانی جذبات کو جن کا تعلق بصارت سے ہے مغلوب اور پریشان کرتے رہتے ہیں - برخلاف اس کے وہ رنگ جو زیادہ دھندلے ہوتے ہیں اُن سے حیوانی جذبات کافی طور سے متاثر نہیں ہوتے جب کرنوں کو دیکھنے سے ہمارے متخیلہ میں سبز رنگ کا خیال پیدا ہو جائے تو اس صورت میں کرنیں بصارت پر ایسی مناسب نسبت سے گرتی ہیں کہ جذباتِ حیوانی یکساں حالت میں کام کرتے رہتے ہیں اور کرنوں اور جذباتِ حیوانی میں برابر کی حیثیت سے کشمکش ہوتی رہتی ہے جس سے طبیعت میں خوشی اور خرمی کے احساسات پیدا ہو جاتے ہیں"

اِس کے اسباب خواہ کچھ ہی ہوں، مگر اس کا نتیجہ یقینی ہے۔ اِسی وجہ سے شعراء سبز رنگ میں خاص طور سے طبیعت کو خوش کرنے والی صفت بیان کرتے ہیں۔

قدرت کے کاموں میں ان دونوں اغراض پر نظر کرنے کے لئے کہ وہ کیسے مفید ہوتے ہیں اور اپنی خوبصورتی کی وجہ سے ہمارے دل کو اپنی طرف کیسا کھینچتے ہیں۔ ہم کو نباتی دنیا پر غور کرنا چاہیئے۔ انکے نہایت ضروری حصے بہت ہی لطیف اور خوبصورت ہوتے ہیں اور وہ تخم ہوتے ہیں جن سے پودوں کی نسل چلتی اور بڑھتی ہے اور اسی وجہ سے وہ پھولوں یا کلیوں میں رہتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے اس میں اپنے اس ارادہ کو پوشیدہ رکھا ہے کہ ظاہر میں اُن کی سرسبزی اور شادابی میں مصروف رہے اور ساتھ ہی اُس کے اپنی بقا کا راز بھی اس میں مضمر رکھے۔ اسی طرح ایک کسان یا باغبان یہی چاہتا ہے کہ ملک کو باغ بنادے اور اس کے باغ کا ہر درخت پھلتا پھولتا رہے، مگر اس کے دل میں صرف یہی خیال ہوتا ہے کہ فصل اچھی ہو اور اسکے نفع میں اضافہ ہو۔

یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ وہ معمولی چیزیں مثلاً پہاڑوں

نی قدرتی سبزی اور شادابی، آبشار صحرا اور اسی قسم کے قدرتی مناظر جن کی نسبت ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، قدرت نے ان ہی چیزوں میں ایک قسم کی خوشنمائی یا کشش پیدا کر دی ہے اور اس خصوص میں اس احتیاط سے کام لیا ہے کہ یہی چیزیں انسان کی طبیعت میں بشاشت اور خرمی پیدا کر دیتی ہیں۔ وہ لوگ جنھیں فلسفہ میں دخل ہے۔ جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی چیز اپنے اصلی خواص میں نظر آتی ہے تو اس سے کوئی خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ مگر جب وہ اس بات پر غور کرتے ہیں تو اس خیال کو بہت بلند کر سکتے ہیں کہ قدرت نے ان چیزوں کو ایسی قوت کیوں دی ہے جو ہمارے دل میں ان کے ذائقہ، رنگ، آواز، خوشبو، سردی اور گرمی سے تخیلی ذوق پیدا ہو جاتا ہے"۔ اس سے قدرت کا سوائے اس کے اور کیا مقصد ہو سکتا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ حیثیت رکھنے والے آدمی کی طبیعت میں بھی ان چیزوں کی خیالی صفات سے خوشگوار جذبات پیدا ہوں البتہ تمام دنیا اس قسم کی چیزوں سے بھری پڑی ہے جن کے دیکھنے سے یا ان کے تصور سے انسان کے دل میں خوشی، خرمی اور ستائش

کے جذبات پیدا ہوجاتے ہیں۔

دن اور رات کے تغیرات، موسموں کی تبدیلی اور اس تبدیلی سے جو قدرتی انقلاب واقع ہوا کرتے ہیں، انسان اپنے ذاتی خیالات سے ان باتوں پر غور کرکے اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ یہ سب باتیں انسان کی طبیعت میں یکے بعد دیگرے کیسے کیسے مسرت کے خیالات پیدا کرتی رہتی ہیں۔

میں یہاں دلچسپی کے مصنوعی سامانوں کا جو دوستی سے کتابوں سے گفتگو سے اور زندگی کے اتفاقی مشاغل سے حاصل ہوتی رہتے ہیں ذکر نہیں کرونگا، اس وجہ سے کہ میں یہاں خوشی پیدا کرنیوالے انھیں اسباب کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ہر مرتبہ کے شخص کو میسر آسکتے ہیں تاکہ میں ان سے کافی وضاحت کے ساتھ ثابت کرسکوں کہ قدرت نے دنیا میں انسان کو اس لئے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ اپنی طبیعت میں اندرونی پیچ وتاب، غم وغصہ اور کڑھن رکھے یا اس کی طبیعت ملول اور رنجیدہ رہے۔

ہر شخص کو چاہئے کہ وہ اپنی طبیعت کو برائی کی طرف نہ بھٹکنے

وے اور ساتھ ہی اس کے دل میں پاکیزہ خیالات رکھے جن سے طبیعت میں اطمینان اور سکون پیدا ہو اور اس کو اس قابل کر دے کہ اگر کبھی مصیبت یا آفت میں بھی وہ اتفاقاً مبتلا ہو جائے تو اس کو بشاشت بشاش رہ کر برداشت کر سکے۔ ان خیالات کی اصولی ترقی سے انسان کی طبیعت میں آسودگی، خرمی، اور لازوال خوشی پیدا ہو جائے گی۔

پیشتر اس کے کہ میں ناظرین کو دنیا کی انتہائی خوبیوں کی طرف متوجہ کروں مجھے اس بات کا اقرار ہے کہ دنیا میں برائیاں بھی بہت سی ہیں جو انھیں اچھائیوں سے جو ہمیں میسر ہیں قدرتی طور پر پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ اطمینان اور آسودگی سے زندگی بسر کرنے کے جن طریقوں کو بیان کیا گیا ہے اگر انسان ان پر اصولاً کاربند ہو کر چلے تو یہ برائیاں انسان کی طبیعت کو متاثر نہیں کر سکتیں۔ قدرت کے کاموں میں اچھائی اور برائی، خوشی اور غم کے متعلق مسٹر لوک نے اپنے ایک مضمون میں جو قدرتی وجوہ بیان کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں :-

"قطع نظر اور سب باتوں کے ہم کو ایک دوسرا سبب یہ بھی ملتا ہے کہ خدا نے ان تمام چیزوں میں جنکا ہمارے خیالات اور احساسات سے تعلق ہے خوشی اور غم کے نشیب و فراز کیوں پیدا کر دئے ہیں اور ان کو ایک دوسرے میں کیوں مخلوط کر دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہم ان تمام خوشیوں کو جو ہمیں دنیا میں حاصل ہوتی ہیں ناکافی، غیر تشفی بخش اور سچی خوشی سے سوا سمجھ کر اللہ عزوجل سے لو لگائیں جس کے پاس لازوال خوشیوں کا انمول خزانہ ہے۔"



انسانی تمدّن کی ترقی

قدرت کے اٹل قانون نے اجناس عالم کے لباس میں درجہ بدرجہ ترقی کی ہے۔ حجر و شجر سے حیوان اور حیوان سے لیکر انسان کی شکل میں اس ہستی کا ظہور ہوا ہے جس کا شہنشاہ آفتاب کے گرد طواف میں مصروف رہنا، امکان سے یقین اور یقین سے ہدایت کا روز روشن پیش کرتا ہے۔ یہ ہستی کے حیرت انگیز مظاہر اپنی شکل و صورت، افعال و خواص کی جگونگی کے علاوہ اپنی باطنی قوت کی وجہ سے اپنے امتیاز ذاتی کا ایسا عجیب و غریب تماشہ پیش کرتے ہیں، جن سے اہلِ بصیرت کبھی سیر نہیں ہو سکتے۔ اس کارگاہ

لہ۔ یہ مضمون سر والٹر اسکاٹ کے مضمون کا ترجمہ ہے۔ بجز تمہید اور کہیں کہیں خفیف سی تبدیلیوں کے اور کسی قسم کا کوئی تغیر نہیں کیا گیا ہے۔ اس تبدیلی سے اصل مضمون کا مفہوم بدلنے نہیں پایا ہے۔ ۲ے قانون قدرت۔ مترجم

ہستی کے معمل کا بیش بہا نتیجہ انسان ہے۔ ایک نسبت سے وہ حیوانی سلطنت کا بادشاہ اور دوسری نسبت سے ملکوتی حکومت کا سردار ہے، اور ان دونوں نسبتوں میں ایسا قومی رشتہ ہے کہ ایک نسبت کی اصلاح دوسری نسبت کی اصلاح پر منحصر ہے۔ چنانچہ اب ہم اس کی پہلی نسبت پر غور کرتے ہیں۔

اگر جانوروں یا پرندوں کے سلسلہ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ ایک دوسرے سے اپنا عندیہ نہیں کہہ سکتے۔ اگر وہ اپنے محسوسات کا اظہار کرنا چاہیں تو آوازوں کے ذریعہ سے اپنا دکھ سکھ امید و بیم کی حالت ایک دوسرے پر ظاہر کرتے ہیں۔ مثل انسانوں کے وہ باقاعدہ بات چیت کر کے اپنے دل کے حالات نہیں کہہ سکتے۔ اللہ عزوجل نے مخلوق کو اپنے حسب منشا بنایا ہے۔ جانوروں یا پرندوں کو اس قسم کی قدرت عطا نہیں کی ہے کہ وہ اپنی حالت کو بڑھا سکیں، ترقی کر سکیں یا ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات کر سکیں۔ چھوٹی چھوٹی چڑیوں کی سمجھ میں بھی حقیقت میں فرق رکھا ہے۔ ایک چڑیا اپنا گھونسلا بہ نسبت دوسری قسم کی چڑیا

کہ بہت اچھا اور نہایت صفائی سے بنا سکتی ہے۔ ایک چوپایہ دوسرے چوپایہ سے زیادہ کھیل تماشوں کا کام سیکھ سکتا ہے اور چونکہ انکو بات چیت کرنے کی قدرت عطا نہیں کی گئی ہے اسلئے وہ اپنے ہم جنسوں سے اپنی معلومات کا اظہار نہیں کرسکتے۔ جو کچھ وہ جانتے ہیں وہ انھیں تک محدود رہتا ہے۔ اسی طرح ہر پرند اور ہر چوپایہ کی نسل میں ابتدائے دنیا سے وہ ہی عادتیں اور وہ ہی خصلتیں چلی آتی ہیں اور جب تک دنیا قایم ہے اسی طرح رہیں گی۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ قدرت کی طرف سے جانوروں کو بہت تھوڑی سی عقل عطا کی گئی ہے اور وہ بھی محدود اور اس محدود عقل سے وہ صرف اپنے لئے تلاش معاش، آرام اور حفاظت کا کام کرسکتے ہیں اور یہ باتیں بھی صرف اسی حد تک کرسکتے ہیں جہاں تک کہ ان کی گذشتہ نسل ابتدائے آفرینش سے کرتی چلی آرہی ہے لیکن وہ اپنی آنے والی نسل سے کسی قسم کی ترقی کے متعلق تبادلۂ خیالات نہیں کرسکتے اور نہ گذشتہ نسل سے کسی قسم کا سبق حاصل کرسکتے ہیں۔ بَیا اور اسی قسم کی دوسری چڑیاں اپنا

گھونسلا اس قسم کا بناتی ہیں کہ اس کے اوپر چھت ہونیکی وجہ سے وہ دھوپ اور بارش سے محفوظ رہتی ہیں۔ اس قسم کے نمونے کا گھونسلا کبھی ان چڑیوں نے نہیں بنا یا ہے جو کھلی جگہ میں ابتدائے آفرینش سے بناتی چلی آرہی ہیں۔

جانوروں اور پرندوں کے ترقی نہ کرنے کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ قدرتی طور سے وہ اپنے ماں باپ کی پرورش میں بہت تھوڑے عرصہ تک رہتے ہیں، چند ہفتوں میں چڑیوں کے چھوٹے چھوٹے بچے اس قابل ہوجاتے ہیں کہ اپنے ماں باپ کی پرورش سے آزاد ہوجائیں۔ قدرت نے چڑیوں پر اس قلیل عرصہ کیلئے ان کی پرورش کا سلسلہ اس لئے قایم کر دیا ہے کہ یہ چھوٹے چھوٹے بچے اس قابل نہیں ہوتے کہ اپنی حفاظت کرسکیں اور خود تلاش کرکے کھاپی سکیں۔ لیکن جب بچے اس قابل ہوجاتے ہیں تو ان کے ماں باپ کی مدد کا سلسلہ قطعی منقطع ہوجاتا ہے، اور غالباً ایک ہی ہفتہ میں بچے اپنے ماں باپ سے بالکل اجنبی ہوجاتے ہیں۔ بھیڑ گائے اور گھوڑے کے بچے چند روز تک اپنے ماں باپ کے پاس رہتے

ہیں اور انھیں کی حفاظت میں کھاتے پیتے ہیں۔ اس عرصہ میں مائیں ان کی دیکھ بھال کرتی ہیں اور اپنا دودھ پلاتی ہیں۔ لیکن جب بچے اس قابل ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنی حفاظت آپ کرسکیں اور خود کھا پی سکیں تو پھر وہ اپنی ماؤں سے علیحدہ ہو جاتے ہیں اور اپنے ماں باپ سے وہ روابط جو پہلے ان کے ساتھ تھے ہمیشہ کیلئے جاتے رہتے ہیں۔

اس طرح جانوروں کا ہر مختلف طبقہ قدرت کے عام قانون کے مطابق بالکل اسی طرح سے رہتا ہے جس طرح اس کی گذشتہ نسل رہ چکی ہے۔ موجودہ جانوروں کی نسل نہ کسی قسم کی ترقی کر رہی ہے اور نہ کرسکتی ہے، جو باتیں وہ جانتی ہے اس کو بھول بھی نہیں سکتی، بلکہ اسی حالت پر رہے گی جس حالت پر ان کی گذشتہ نسل تھی اور آنے والی نسل بھی اسی حالت میں رہیگی۔

انسان کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ اللہ عزوجل نے انسان کو اپنا ہم شبیہ بنایا ہے، اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ خالق ارض وسما کی بھی کوئی ظاہری شکل وصورت ہے جس سے انسان شباہت رکھتا ہے، ہرگز نہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خداوند عالم

کہ قدرت نے جس طرح سے دنیا کو پیدا کیا ہے ایک ایسی ذات ہے جو ہم کو
دکھائی نہیں دیتی اور سمجھ میں نہیں آ سکتی اور اسی کے نور کے پرتو کا نام روح ہے
جو انسان کے اندر رہتا ہے اسی روح کی بدولت انسان ہر ایک کام
کرتا ہے۔ مرنے کے بعد روح اس کے جسم سے نکل کر روحانی
دنیا میں چلی جاتی ہے اور جو کچھ اس نے دنیا میں کیا ہے اسکی پرسش
روح ہی سے ہوتی ہے۔ جب انسان کو اچھائی اور برائی کی تمیز
سکھلائی گئی ہے اور یہ قدرت کی ان قوتوں سے ملی ہے جن
قوتوں کو ہم فرشتہ کہتے ہیں تو پھر ایسی صورت میں ناممکن تھا کہ
انسان کو ایسی مخلوق کے طبقہ میں رکھا جاتا جو اپنے افعال کی ذمہ دار
نہیں ہے اور جن کی عقل و تمیز اور سمجھ محدود رکھی گئی ہے، اپنی
حالت کا نہ اندازہ کر سکتے ہیں اور نہ مخلوق ہونے کی حیثیت سے
اپنی حالت کو گھٹا بڑھا سکتے ہیں۔ انسان کے جسم کے تمام اعضاء
روح سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ اگر ان کو بجا طور پر استعمال کیا
جائے تو ان کی قوت ہر گھڑی ترقی کرتی رہتی ہے۔ اور صرف یہ
ہی نہیں بلکہ انسانوں کے گروہ اور قومیں باہمی اتحاد و محبت کی

لڑتی میں منسلک ہو جاتی ہیں، اور ان میں ترقی کرنے کی وہ ہی قوت ہوتی ہے۔ اگر زمانہ موافقت کرے تو رفتہ رفتہ انسانوں کے برہنہ وحشی گروہ طاقت ور اور مہذب ہو جاتے ہیں۔ انسان کو دن بدن ترقی کرنے کی استعداد قدرت کی طرف سے عطا ہوئی ہے اور اس استعداد کی بنا پر ہم کو اشرف المخلوقات ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے اور یہ صرف انسانوں ہی کا حصہ ہے۔ اچھا! آؤ اسکو ذرا غور سے دیکھیں کیونکہ اس میں وہ حقیقت پوشیدہ ہے جس سے تعجب بھی ظاہر ہوتا ہے اور عظمت بھی۔

اگرچہ انسان کو قدرت کی طرف سے وہی غیر فانی روح عطا کی گئی ہے جس کے متعلق اوپر لکھا جا چکا ہے اور اسی کی وجہ سے اس کو ہر اچھے کام کو اختیار کرنے اور ہر برے کام کو نہ کرنے ہر کام میں فیصلہ کرنے اور رد کرنے، ہر بات کا سبب ڈھونڈھنے اور اس کے انجام پر غور کرنے کی قدرت دی گئی ہے ان باتوں پر غور کرکے اور سبب کو دریافت کرکے وہ کسی نتیجہ پر پہنچتا ہے اگر اس نتیجہ کو بات چیت کے ذریعہ وہ اپنے ہمجنسوں پر ظاہر

نہ کرسکتا تو یہ امر بالکل بدیہی تھا کہ ہر انسان کے معلومات کی ترقی صرف اس کے مشاہدات اور صرف اسی کے دلائل تک محدود رہتی لیکن قوت گویائی کے عطیہ سے ہر شخص اس قابل ہوتا ہے کہ جو کچھ ترقی کے خیالات اس کے دل میں پیدا ہوں دوسروں پر ظاہر کردے اور اس طرح یہ خیالات جو ایک شخص کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اسی کے ساتھ محدود نہیں رہ جاتے بلکہ ایک اچھی خاصی جماعت کو ان خیالات کا علم ہو جاتا ہے اور انھیں خیالات میں آئندہ معلومات اور انکشافات سے عموماً حسب ضرورت اور حسب موقع ترقی ہوتی رہتی ہے اور اسی کی بدولت وسیع معلومات کے آدمی اور موجد پیدا ہو جاتے ہیں۔ قوت گویائی ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ سے ہم اپنے خیالات دوسروں کو بہم پہنچا سکتے اور یہ ہی قوت گویائی ایک ایسی نعمت ہے جس کی وجہ سے انسان جانوروں سے اسقدر شاندار امتیاز رکھتا ہے جو اسکو حاصل ہے۔

انسانی سوسائٹی کی ترقی کا ایک دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ انکے بچے عرصہ دراز تک اس قابل نہیں ہوتے کہ خود کچھ کام

کر سکیں اور اسی وجہ سے اپنے والدین کی نگرانی اور پرورش کے بہت دن تک محتاج رہتے ہیں۔ یہ عموماً دیکھا گیا ہے کہ جس جگہ کھانے پینے کی قدرتی پیداوار کثرت سے ہوتی ہے بچے یہ بھی نہیں جان سکتے کہ آیا یہ چیزیں کھانے کے کام میں بھی آسکتی ہیں یا نہیں یہی واقعہ ان مقامات پر بھی پیش آتا ہے جہاں لوگوں کا گذارہ جنگلی جانوروں کے شکار یا کاشتکاری پر ہوتا ہے یہ ایسے کام ہیں جن میں تھوڑی سی ذاتی محنت اور سمجھ کی ضرورت ہے مگر بچے جب تک تیرہ یا چودہ برس کے نہیں ہو جاتے وہ ان کاموں میں سے ایک کام کو بھی نہیں کر سکتے۔ ان واقعات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ قانون قدرت یہی ہے کہ برخلاف جانوروں یا پرندوں کے بچوں کے انسان کے بچے اس وقت تک اپنے والدین کی پرورش اور نگرانی میں رہیں جب تک کہ ان کو اچھی خاصی سمجھ نہ آجائے اور اس دوران میں ان کے والدین ان کو مفید مطلب باتیں پڑھا اور سکھا نہ دیں۔ قدرت کے اس عجیب و غریب انتظام سے ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ انسان کے بچے چونکہ اپنے والدین کے ساتھ مدت العمر رہتے

ہیں اس لئے بچوں کو ماں باپ کی محبت دائمی ہوتی ہے اور بچوں کی طبیعت میں والدین کی ہا واسطہ خصائل کا اثر جذب ہوتا رہتا ہے۔ برخلاف اس کے جانوروں اور پرندوں کے بچے چونکہ اپنے ماں باپ کے ساتھ بہت کم عرصہ کے لئے رہتے ہیں اس لئے ان کی محبت اپنے ماں باپ کے ساتھ عارضی ہوتی ہے۔

ان ہی وجوہ کی بناء پر انسان کے بچے اپنے والدین سے جدا ہونے کے لئے کبھی خود کوئی خواہش نہیں کرتے بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اسی مکان یا جھونپڑے میں جس میں وہ پیدا ہوتے ہیں اپنے ماں باپ کے ساتھ عمر بسر کر دیتے ہیں اور جب ان کے والدین بڑھے ہو جاتے ہیں تو ان کو وہ کما کر کھلاتے ہیں۔ اس طرح ایک دو خاندان آپس میں مل جاتے ہیں اور ان میں اتحاد و اتفاق قایم ہو جاتا ہے اور وقت پر ایک دوسرے کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ انسانی سوسائٹی کی یہ پہلی منزل ہے۔ اکثر انسانی گروہ نہایت وحشیانہ حالت میں پائے گئے ہیں اور

ان کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی حالت جانوروں کی حالت سے کم نہ تھی۔ دنیا کے بعض حصوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کو انسان مشکل سے کہا جا سکتا ہے۔ یہ لوگ کپڑے نہیں پہنتے رہنے کے لئے جھونپڑے یا گھر نہیں ہوتے، ان کا گزارہ جانوروں کے شکار پر ہوتا ہے اور نہایت مکروہ چیزیں مثلاً سانپ مینڈک اور کیڑے مکوڑے تک کھا جاتے ہیں۔

اس ابتر حالت کے علاوہ بھی برخلاف جانوروں کے اللہ عزوجل نے انسان کو ایسی قدرت عطا کی ہے جس سے وہ بڑی بڑی ترقیاں کر سکتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ ہی وحشی گروہ مہذب انسان بنجاتے ہیں۔ جھونپڑے بناتے ہیں جن سے دھوپ کی گرمی اور بارش کی تکلیف سے محفوظ رہتے ہیں۔ ہتھیار بناتے ہیں جن کی وجہ سے ضرر رساں جانوروں سے نجات ملجاتی ہے۔ حلال جانوروں کو مار کر ان کا گوشت کھاتے ہیں اور چمڑا کام میں لاتے ہیں۔ اور انھیں جانوروں کو زندہ پکڑ کر پال لیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ مختلف اسباب سے ان کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اگر ان چیزوں پر محنت

اور صنعت کی جائے تو پیداوار میں اور اضافہ ہوگا اور زندگی آرام اور اطمینان سے بسر ہوگی۔ اس طرح انسانی سوسائٹی کی ترقی تا وقتیکہ کوئی غیر معمولی رکاوٹ نہ پیدا ہو جاری رہتی ہے اور آنے والی نسلیں حاصل شدہ فوائد کے ساتھ ساتھ نئی دریافتوں کو اپنے مشاہدات سے آگاہ کرتی رہتی ہیں۔ جو باتیں اسلاف کو معلوم نہ تھیں ان کے جاننے کے لئے بھی سرگرم کوششیں کرتی رہتی ہیں۔

مثال کے طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ جب تین یا چار وحشیوں کے خانہ بدوش آوارہ گرد خاندان ایک جگہ آباد ہو جاتے ہیں۔ زمین کو کاشت کرنا شروع کر دیتے ہیں اور بہت سی جھونپڑیاں بنا لیتے ہیں تو یہ جگہ ایک گاؤں کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ پھر اس گاؤں کے سب آدمی ملکر عموماً اسی آبادی میں سے کسی ایک آدمی کو منتخب کر لیتے ہیں تاکہ وہ زمانہ امن میں ان کے قصوں اور قضیوں کا تصفیہ کر دیا کرے اور جب کسی دوسرے فرقہ سے کوئی لڑائی یا جنگ چھڑ جائے تو ان کی سپہ سالاری بھی کرے

یہ کیا ہے؟ شخصی سلطنت کی بنیاد کا سلسلہ ہے۔ یا اگر وہاں کی آبادی کے ملکی معاملات کسی جماعت یا سن رسیدہ اور صاحب فہم منتخب افراد کے ذریعہ طے پاتے ہیں تو یہ کیا ہے؟ جمہوری حکومت کی آغاز کا سلسلہ ہے۔ بہر کیف یہ آبادی کسی نہ کسی صورت میں ایک باضابطہ سلطنت سے ملتی جلتی معلوم ہوتی ہے۔ اور یہ ہی لوگ ایسے قوانین بناتے ہیں جنکی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے لڑ جھگڑ نہ سکیں۔

دوسری ضروری تبدیلیاں حسب موقع اور حسب ضرورت پیدا ہوتی ہیں بے شبہ پہلے پہل جماعت کا ہر فرد درختوں کے پھل اور شکار کئے ہوئے جانوروں کا گوشت جمع کر کے رکھ لیا کرتا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد واقعات نے انھیں خود سکھا دیا کہ جس شخص نے جس چیز پر کوئی محنت یا مشقت اٹھائی ہے تو اس کی محنت اور مشقت سے یہ چیز وجود میں آئی ہے۔ اسی طرح اس بات کو تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ جس شخص نے جو درخت لگایا ہے اس کے پھلوں سے وہی شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اور جس شخص نے کسی کھیت میں کوئی چیز کاشت کی ہے وہ ہی اس کو کاٹ بھی سکتا ہے۔ بغیر کسی چیز کے بوئے اور

کاشت کیے کوئی چیز نہ اُگے گی۔ اسی وجہ سے جس شخص نے جو چیز بوئی یا کاشت کی ہے تو اس کی پیداوار بونے یا کاشت کرنے والے کی محنت کا نتیجہ کہلاتا ہے۔ اسی طرح سے ملک میں جو لوگ جس زمین کو کاشت کرتے ہیں وہ انھیں کی ملک کہلاتی ہے اور جن لوگوں نے جن جنگلوں کی نگہداشت کی ہے وہ انھیں کا علاقہ کہلاتا ہے۔ اگر ایک ملک میں دوسرے ملک کا آدمی آجاتا ہے تو دونوں سلطنتوں میں جنگ چھڑ جاتی ہے اور پھر حسب دلخواہ شرائط پر صلح ہو جاتی ہے۔ اس طرح ایک نئی سلطنت اپنے مقبوضات کو اس طرح سے بڑھاتی رہتی ہے اور وقتاً فوقتاً ہے گشت و خون کر کے اپنے ملک میں معاشرتی قوانین بناتی ہے جس کی لوگوں کو ہر حالت میں بوقت جنگ کاربند یا اس کا پیروی کرنی پڑتی ہے۔

انسان کو اپنی وحشیانہ اور ابتدائی حالت سے مہذب انسان ہونے کے زمانہ تک جو دوسرے واقعات پیش آتے ہیں وہ بھی بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ان واقعات میں نہایت ضروری بات یہ ہے کہ

کی فرقہ بندی اور روپیہ پیسہ کے استعمال کی ترویج ہے۔ اب ان بڑی بڑی تبدیلیوں کے سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے جو اکثر پیش آیا کرتی ہیں۔

ابتدائی حالت میں سوسائٹی کا ہر ممبر ضروریات زندگی کے لئے تمام سامان خاص اپنی ذاتی محنت سے مہیا کرتا تھا۔ یعنی اپنے لئے خوراک خود شکار کر کے حاصل کرتا تھا۔ غرض صرف اپنے لئے بوتا تھا اور کاٹتا تھا۔ جیسا کہ غیر قوموں میں ہر آدمی صرف اپنی ذات کے لئے مخصوص تھا۔ جس جانور کا وہ شکار کرتا تھا اسکی کھالوں سے صرف اپنے ہی لئے لباس اور جوتے بنایا کرتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ معلوم ہوتا گیا کہ فرض کرو ایک شخص نوجوان ہے چست چالاک ہے اور اچھی محنت و ریاضت کرتا ہے اس نے شکار کرنے میں خاصی مہارت پیدا کر لی ہے اور دوسرے شخص کی نسبت ہوتے ہوتے یہ معلوم ہوا کہ وہ پہلے شخص سے بھی زیادہ سنجیدہ اور مستقل مزاج آدمی ہے اور کھیتی بونے اور مویشی کے رکھ رکھاؤ میں اچھی خاصی مہارت رکھتا ہے اور اسکے

شخص کی نسبت یہ معلوم ہوا کہ وہ محنت و مشقت کے کاموں سے معذور ہے غیر مستقل مزاج ہے اور صرف ایسے کام کرسکتا ہے جو گھر میں بیٹھکر انجام پا سکتے ہیں مثلاً کپڑے سینے کا کام جوتے بنانے کا کام اس لئے اس میں ان تینوں آدمیوں کے اغراض پوشیدہ ہیں۔ یعنی یہ کہ پہلا شخص سوائے شکار کے اور کوئی کام نہیں کریگا' دوسرا شخص کھیتی باڑی کے کام میں مصروف رہے گا اور تیسرا شخص کپڑا سی کر اور جوتا بنا کر اپنی بسر اوقات کرے گا۔ اس سے یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ شکاری شکار کا گوشت اور چمڑا دیکر کسان سے اپنے اور اپنے بال بچوں کے کھانے کے لئے غلہ لیگا۔ اور شکاری اور کسان کو تیسرے شخص سے جوتہ اور کپڑا لینے کے لئے اس کو گوشت اور غلہ دینا پڑے گا۔ اس طرح سے ہر شخص جدا جدا پیشہ اختیار کرکے اپنے کاروبار میں اچھی خاصی معلومات پیدا کرکے اسے بوجوہ احسن انجام دے سکتا ہے اگر ان تینوں آدمیوں میں سے ہر ایک شخص شکاری بھی ہوتا کسان بھی ہوتا اور درزی بھی' تو بجائے اس کے وہ انھیں آسانی اور کامیابی سے کرسکے دو پیشوں کو بھی کامیابی اور آسانی سے نہیں چلا سکتا تھا۔

چیزوں کا اس قسم کا ردّ و بدل مبادلہ کہلاتا ہے اور یہ ابتدائی قسم کی تجارت کہلاتی ہے جس سے لوگ اپنے مال کا جو اُن کی ضرورتوں سے بچ رہا ہے آپس میں مبادلہ کرتے رہتے ہیں۔

لیکن زمانہ اور وقت کے لحاظ سے مبادلہ تکلیف دہ معلوم ہونے لگا۔ وہ اس وجہ سے فرض کرو کہ درزی کو اس وقت غلہ کی ضرورت ہے اور کسان کو کپڑے کی ضرورت نہیں ہے یا درزی کو اس وقت گوشت یا چمڑے کی ضرورت نہیں ہے جس کو شکاری مبادلہ میں دینا چاہتا تھا۔ اس مصیبت کو رفع کرنے کے لئے تمام قوموں نے "روپیہ" ایجاد کیا ہے یعنی دھات کو چند چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیا ہے جن کی کوئی قیمت نہیں ہوتی بلکہ انسانوں نے تجارتی اغراض کے لئے ان کی ایک فرضی قیمت معین کر لی ہے ہر ملک میں مختلف قسم کا سکہ چلتا ہے۔ پہلے زمانہ میں بعض ملک میں چمڑے کا سکہ چلتا تھا بعض میں کپڑے یا لوہے کا۔ مگر اب سونے اور چاندی کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر کے اس خاص مقصد کیلئے تمام دنیا میں رواج دیا ہے۔

اس گردش میں رہنے والی تجارت کی فرضی قیمت کا استعمال
اور اس کے فوائد اس طرح سمجھئے جیسا پہلے بتایا جا چکا ہے - فرض
کرو کہ شکاری کو کپڑے کی ضرورت ہے اور درزی کو مبادلہ پر حاصل
کرنے کے لئے گوشت کی ضرورت نہیں بلکہ غلہ کی ضرورت ہے اور
کسان کو اس وقت کپڑے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ضروریات
زندگی میں سے کسی اور چیز کی ضرورت ہے - ان تینوں آدمیوں
میں سے ہر ایک کو اپنے آرام و آسائش کے لئے کسی نہ کسی چیز
کی ضرورت ہے اور جو مبادلے سے دستیاب نہیں ہو سکتیں
اس لئے کہ جن لوگوں سے وہ مبادلے کے ذریعہ چیزیں حاصل کرنا
چاہتا ہے ان کو ان چیزوں کی مبادلہ پر لینے کی ضرورت نہیں
ہے - لیکن فرض کرو کہ اب روپیہ کا استعمال مروج ہو گیا ہے اور
اس کی قیمت بھی مان لی گئی ہے تو اب یہ تینوں شخص روپیہ کے
ذریعہ نہایت سادہ طریقہ سے بیوپار کر سکتے ہیں - شکاری اس وقت
شکار کا گوشت یا چمڑا بیچنا چاہتا ہے مگر درزی کو اس وقت اس
کی ضرورت نہیں ہے لیکن وہ گاؤں میں کسی اور شخص کو یا چیز دیجیو

میں بیچ دیتا ہے اور پھر درزی کے پاس جاتا ہے۔ اگرچہ اس وقت درزی مبادلہ کے ذریعہ اپنا مال علیحدہ کرنا نہیں چاہتا مگر اب روپیہ کے عوض بخوشی فروخت کر دیتا ہے اور روپیوں کو لیکر کسان کے پاس جاتا ہے اور اس سے ضروری چیزیں خرید لیتا ہے۔ اب کسان بھی اس روپیہ سے ضروری سامان خرید لیتا ہے اور جو کچھ روپیہ بچتا ہے اس کو ضرورت کے وقت کام میں لانے کے لئے اپنے پاس حفاظت سے رکھ لیتا ہے۔

روپیہ کی ایجاد میں رفتہ رفتہ ترقی ہوتی رہی ہے۔ بہت سے لوگ مختلف چیزوں کو خرید کر بیچنے کا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں یعنے چیزوں کو خرید کر گراں فروخت کرتے ہیں۔ یہ طریقہ ہر جماعت کیلئے مفید ہوتا ہے۔ سامان کا اصلی مالک چیزوں کو دوکانداروں کو لے نفع سے اس لئے فروخت کر دیتا ہے کہ اس کو گشت لگا کر بیچنے کی تکلیف سے نجات ملجاتی ہے۔ عوام کو جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے دوکانداروں سے واجبی قیمت پر خرید لیتے ہیں۔

سکّے کے رواج پاتے ہی لوگوں کے لئے دوسرے واقعات

کے ساتھ ساتھ بہت سے کاروبار کھل جاتے ہیں اور یہ بات بھی عموماً ظاہر ہوتی ہے کہ سوسائٹی کی ابتدائی منازل میں درجہ مساوات بہت جلد غارت ہو جاتا ہے۔ بہت سے لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھ لیتے ہیں اور امیر ہو جاتے ہیں، اپنے کاروبار میں مدد لینے کے لیئے لوگوں کو نوکر رکھ لیتے ہیں۔ بہت سے لوگ اپنی کمائی کو فضول خرچیوں میں ضایع کر کے مفلوک الحال ہو جاتے ہیں اور غلامی کی حیثیت میں رہ کر فنا ہو جاتے ہیں۔ بہت سے آدمی عقلمند اور ہوشیار ہوتے ہیں اور اپنی فراست اور اپنی دانشمندی کی وجہ سے لڑائیوں اور بہ امن زمانہ میں دوسرے لوگوں سے ممتاز سمجھے جاتے ہیں۔ یہ ہی لوگ ملکی معاملات میں بھی سر برآوردہ خیال کیئے جاتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کی بڑی تعداد ایسی ہوتی ہے کہ ان میں شجاعت نام کو نہیں ہوتی اور صرف پیروی سے کام چلاتے ہیں، یہ ہی لوگ ہر قسم کی جدت سے عاری ہوتے ہیں۔

موخر الذکر اسی بندش میں پھنس کر فنا ہو جاتے ہیں، مگر دوسرے لوگ جن میں جدت اور سمجھ ہوتی ہے ترقی کرتے کرتے فوجوں کے جنرل

اور مدبر ہو جاتے ہیں علمی ترقی کی خواہش سے اپنے درجہ میں ترقی کرنے کی تمیز آجاتی ہے۔ جو لوگ اپنے ماں باپ کی نگرانی میں یا اپنی ذہنی اور دماغی قابلیت کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں تو وہ ہی لوگ فرقہ جہلا سے علیحدہ ہو جاتے ہیں اور اپنا امتیازی درجہ اور حالت قایم کرکے اپنے سے کمتر لوگوں سے صرف ضروری مراسم رکھتے ہیں۔

اس طریقہ سے سوسائٹی کا سارا نظم بدل جاتا ہے اور ایک بڑے خاندان کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ اس میں مساوات کا درجہ قایم نہیں رہتا بلکہ یہ خاندان مختلف طبقے کے لوگوں، مختلف جماعتوں کے حالات کی بندشوں سے مشابہت رکھتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ایک قوم اپنی قدرتی اور ابتدائی حالت سے زیادہ پیچ در پیچ طریقوں میں ترقی کرتی ہے جس سے اس کے درجوں میں دوسری قوموں سے امتیاز پایا جاتا ہے اور یہ طریقہ سوسائٹی یا تمدن کی ترقی کہلاتا ہے۔ اس قسم کی ترقی میں دوسرے انسانی کاموں کی مانند بھلائی اور برائی بھی شامل رہتی ہے۔ آنے والی انسانی نسلوں کی ایجادوں اور ترقیوں کے لئے یہ لازمی ہے کہ ان میں جلد یا بدیر تغیرات ضرور

واقع ہوں مگر یہ ہماری خلقی فطرت کا قانون معلوم ہوتا ہے۔

ایک اور دوسری تبدیلی جو متمدن ہونے کے لئے تدریجی ترقی کے نتائج سے برآمد ہوتی ہے وہ بھی بہت کچھ اہمیت رکھتی ہے۔ سوسائٹی کی ابتدائی حالت میں قبیلہ کا ہر شخص جنگجو ہوتا ہے اور اس سے یہ خدمت اس وقت لی جاتی ہے جب ملک کو ضرورت ہو۔ لیکن ہوتے ہوتے فوجی ہنر کم از کم معمولی مواقع پر بھی انھیں لوگوں کیلئے مخصوص ہو جاتا ہے جو سپاہی کا پیشہ اختیار کرتے ہیں اور جن کا یہ کام ہوتا ہے کہ جب ملک کو ضرورت ہو لڑیں۔ اس کے صلہ میں ان کو (ملک کی) جماعت تنخواہ دیتی ہے۔ اس طریقہ سے ملک کے جو افراد بچ جاتے ہیں وہ اپنی مرضی کے مطابق کوئی نہ کوئی پُرامن پیشہ اختیار کر لیتے ہیں۔ اس تبدیلی سے ایسے اہم نتائج برآمد ہوتے ہیں جنکو ہم سر دست گنوا بھی نہیں سکتے۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ وہ اہم تبدیلیاں جن سے انسان جھونپڑوں اور غاروں میں رہنے کے بجائے محلوں اور شہروں میں رہنا اختیار کرتا ہے اور جہالت اور قعرِ مذلت میں گرنے کے بجائے سائنس

میں معلومات حاصل کرتا ہے اور عناصر کو اپنے قبضہ میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس قسم کی قدرت اللہ عزوجل نے اپنی عنایات سے صرف انسان ہی کو عطا کی ہے۔ اور دوسرے درجہ کی قدرت خالق اکبر نے انسان کو گویائی کی عطا کی ہے جس سے ہم اپنے خیالات کا نتیجہ بات چیت کے ذریعہ ایک دوسرے پر ظاہر کرتے رہتے ہیں۔

لیکن یہ تو صاف ظاہر ہے کہ جب سوسائٹی کی ترقی زبانی روایات پر منحصر ہوگی تو ضرور ہے کہ اس میں بہت سی رکاوٹیں ہوں، کہنے والے کے خیالات سننے والا حرف بحرف یاد نہیں رکھ سکتا اسی وجہ سے اس میں لغزش کا اندیشہ ہے۔ یہ تو عموماً پایا گیا ہے کہ جب تک فن تحریر ایجاد نہیں ہوا تھا علم نے بہت سست رفتار سے ترقی کی ہے فن تحریر سے گزشتہ نسلوں کے متعلق مقررہ نتیجے ہوئے اور اصلی حالات معلوم ہو سکتے ہیں جب یہ بیش بہا فن معلوم ہوگیا تو یقیناً یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ترقی اور بقائے علم کی بنیاد پڑ گئی۔ پرانی تحریریں لوگوں کے پاس سے نکلیں اور ان کو حفاظت سے رکھ دیا گیا تاکہ وہ ضائع نہ جا سکیں یہ تحریرات مختلف لوگوں کی نظروں سے گزریں اور رفتہ رفتہ تبادلہ

خیالات سے اچھی طرح سمجھ لی گئیں۔
فن تحریر سے شدید تبدیلیوں کے خلاف ایک روک تھام قایم ہو جاتی ہے۔ ایسے شدید تغیرات سوسائٹی کی ابتدائی حالت میں بہت واقع ہوتے ہیں جن سے تمام علوم کے ثمرات اس طرح ضایع ہو جاتے ہیں جیسے آندھی سے درختوں کے پتے۔ مثال کے طور پر یہ سمجھ لو کہ انسان کے ابتدائی زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ کسی قوم نے فنون میں خاطر خواہ ترقی کی تھی اور اس قوم کو کسی طاقتور اور کثیر التعداد قوم نے (گو یہ قوم بہ نسبت مفتوح قوم کے علوم سے بے بہرہ تھی) فتح کر لیا۔ تو صاف ظاہر ہے کہ اس حالت میں وحشی اور جاہل فاتح مفتوح قوم کے علوم و فنون کی کوئی قدر نہ کرینگے اگر مفتوح قوم کے لوگوں کو اپنے علوم و فنون میں سے کچھ زبانی یاد بھی رہا تو وہ رفتہ رفتہ ان کی یاد سے محو ہو جائے گا اور اگر انکے اسلاف نے کارآمد معلومات کو لکھ کر رکھ لیا تھا۔ ان مسودات پر گو کچھ عرصہ کے لئے توجہ نہ کی جائے اور حوادث زمانہ سے محفوظ رہ سکے تو کوئی نہ کوئی ایسا خوش نصیب وقت ضرور آئے گا کہ غالباً

ان پر توجہ کی جائے گی۔ ایک واقعہ ایسا پیش آبھی چکا ہے یعنی یہ کہ جس وقت سلطنتِ روم معراجِ کمال پر پہنچ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور اس کو دوسرے وحشی مگر بہادر قبائل نے آکر فتح کر لیا تو روم کے علوم اجتہاد کے قابل ستایش مسودات جو اتلاف سے بچکر پرانے کتب خانوں میں محفوظ رہ گئے تھے ان کی آج کل بہت قدر ہو رہی ہے۔ اس بات کو ایک مستند مقولہ سمجھنا چاہیئے کہ "کوئی قوم اسوقت تک کارآمد علوم یا تمدن میں کوئی بڑی ترقی نہیں کرسکتی جب تک کہ کتابت کی ایجاد سے ان کی ترقی کے ذرایع مستحکم اور مستقل طور سے محفوظ نہ کرلئے گئے ہوں"۔

ایک دوسرا انکشاف بھی ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ فن تحریر یہ انکشاف پندرھویں صدی عیسوی میں ہوا ہے۔ اس سے مراد چھاپے کی ایجاد ہے۔ ہاتھ سے لکھنے کا کام ہمیشہ سست مشکل اور زیادہ صرفہ کا ہوتا ہے۔ جب کوئی کتاب ہاتھ سے لکھی جاتی ہے تو وہ کسی کتب خانہ میں کتابوں کے انبار میں رکھ دیجاتی ہے جہاں ممکن ہے کہ طالبعلموں کی نظر سے نہ گزر سکے یا جس کو چند ہی لوگ

نہ جا سکیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کتاب کسی نہ کسی حادثہ کی نذر ہو جائے لیکن چھاپے کی ایجاد سے یہ فائدہ ہو گیا ہے کہ ایک مسودہ سے ہزاروں کتابیں تیار ہو سکتی ہیں اور بہت کم وقت میں نصف درجن ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابوں کی بھی قیمت کے اس میں صرفہ کم ہوتا ہے۔ جب سے چھاپہ کی ایجاد کا شاندار انکشاف ہوا ہے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہر قسم کے علوم خانقاہوں کی تاریکی سے روشنی میں لائے گئے ہیں اور جامعوں میں جہاں صرف چند طلبہ دن کی خاصی روشنی میں علوم سے بہرہ ور ہوتے تھے، اب وہاں علوم و فنون کا خزانہ ہر شخص کے لیئے کھلا ہوا ہے۔

تواریخ کی تحقیقات کے کام ہوں یا سائنس کے اخلاقیات سے متعلق ہوں یا کسی قسم کی دلچسپیوں سے چھاپہ خانہ میں چھاپ کر شایع کیئے گئے اور ان کی اشاعت مشرق سے مغرب تک کر دی گئی اس کام میں اشاعت کرنے والوں کا فائدہ بھی ہوتا ہے۔ اس طریقہ سے کارآمد فنون کے صفحہ ہستی سے مٹ جانے یا بڑی بڑی علمی معلومات کے اتلاف کا خدشہ چند ہی سال میں جاتا رہا۔

الغرض چھاپہ ایک ایسی چیز ہے جس سے انسان دوسرے ملک کے آدمیوں کو ضروری باتوں سے ایک ہی وقت میں آسانی سے مطلع کر سکتا ہے خواہ وہ باتیں اچھی ہوں یا بری ضبط تحریر میں آئی ہوئی باتوں کو انسان بہت آسانی سے سمجھ بھی سکتا ہے۔ تحریر اور تقریر میں بڑا فرق ہے۔ مقرر کی باتیں صرف وہی لوگ سُن سکتے ہیں جو وہاں موجود ہوں۔ مگر ایک کتاب کے مصنف کا خطاب بصر موجودہ نسل ہی سے نہیں ہوتا بلکہ آنے والی نسلیں بھی مصنف کے خیال سے آگاہ ہو سکتی ہیں اور بہ نسبت مقرر کے کسی کتاب کی مصنف کا درجہ بڑھا ہوا ہے۔

اس مضمون میں عام تمدن کی تدریجی ترقی کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے جو قوموں میں رفتہ رفتہ پیدا ہوتا ہے۔ جیسے جیسے قوانین یا تعلیم گاہوں میں یا اور دوسرے معاملات میں جو مفید ہوں یا نہ ہوں ترقی یا تنزل ہوتا رہتا ہے ویسے ویسے انسان ترقی اور تنزل کے اسباب سے نتیجہ نکالتا رہتا ہے کہ آخر اس ترقی اور تنزل کا سبب کیا ہے۔ انسان کو اللہ عزوجل نے اسی لئے قوت تمیز عطا کی ہے

اور یہ قوت غیر فانی قوت ہے اور اسی قوت کی بناء پر وہ تدریجی ترقی کرتا رہتا ہے۔ برخلاف اس کے یہ ہی قوت جانوروں کو بھی قدرت کی طرف سے عطا کی گئی ہے مگر وہ صرف اس سے اپنی حفاظت اور تلاش معاش کا کام لے سکتے ہیں اور یہ باتیں ان میں روز ازل سے چلی آتی ہیں اور اسی طرح ابد تک رہیں گی۔

فقط



روح کے کرشمے

ترجمہ از مسٹر ایمرسن

زندگی کی ایک ساعت باعتبار وقعت اور اثر کے دوسری ساعت سے مختلف ہوتی ہے۔ ہمارا ایمان لمحوں کے لئے آتا ہے مگر ہماری برائیاں دائمی ہیں۔ تاہم ایمان کے ان مختصر لمحوں میں ایک زور ہوتا ہے جو ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم بہ نسبت ان واقعات کے جو ہم پر گذر چکے ہیں ان مختصر لمحوں کو زیادہ حقیقی سمجھیں۔ اسی بناء پر یہ دلیل کہ تجربہ حقایق کے پرکھنے کا اصل معیار ہے ہمیشہ ان لوگوں کے خاموش کرنے کے لئے پیش کی جاتی ہے جو انسان سے غیر معمولی توقعات رکھتے ہیں مگر ہمیشہ کے لئے غلط اور لغو ہو جاتی ہے۔ اس لئے ہم زمانہ گذشتہ کو معترضین کے لئے چھوڑتے ہیں اور آئندہ

کے لئے امید کرتے ہیں۔ ہمیں اس امید کی ضرور تشریح کردینی چاہیئے
ہم تسلیم کرتے ہیں کہ انسانی زندگی بے حقیقت ہے۔ مگر ہمیں کیونکر معلوم
ہوا کہ وہ بے حقیقت ہے؟ ہماری اس بےچینی اور دیرینہ بے صبری کی
کیا بنیاد ہے؟ ہماری معلومات میں اس کمی اور لاعلمی کا مفہوم کیا ہے
بجز اس لطیف ادعا کے جس کے ذریعہ روح خود اتنا بڑا دعویٰ کرتی
ہے؟ آخر انسان کیوں محسوس کرتا ہے کہ اس کی نیچرل تاریخ ابتک
قطعی نہیں لکھی گئی ہے بجز اس کے کہ جو کچھ تم نے اس کے بارے
میں کہا ہے وہ اس سے برابر ترقی کر جاتا ہے۔ یہانتک کہ وہ باتیں
جو پہلے اس کی نسبت لکھی گئی تھیں قصہ پارینہ ہو جاتی ہیں اور الٰہیات
کی کتابیں بیکار سمجھی جاتی ہیں؟ چھ ہزار برس کے فلسفہ نے روح کے
نکات اور خزانوں کو دریافت نہیں کیا ہے۔ اس کے تجربات کی
آخری تشریح میں ایک معمہ ہمیشہ ایسا رہ گیا جو حل نہ ہو سکا۔ انسان
ایک ایسا چشمہ ہے جس کا منبع نامعلوم ہے۔ ہماری نسلیں چلی آرہی
ہیں مگر یہ نہیں معلوم کہ کہاں سے۔ نہایت صحیح حساب داں بھی یہ
نہیں بتا سکتا کہ آگے والے لمحہ میں کیا پیش آنے والا ہے۔ میں خود

ہمیشہ یہی چاہتا ہوں کہ بہ نسبت اپنی مرضی کے جس کو میں اپنا کہتا ہوں، واقعات کی زیادہ ارفع اصل تسلیم کروں۔

جو باتیں واقعات کے ساتھ پیش آتی ہیں وہ خیالات کے ساتھ بھی پیش آتی ہیں۔ جب میں خیال کی روانی پر غور کرتا ہوں جو بالکل نامعلوم طریقے سے تھوڑی دیر کے لئے میرے اندر موجزن ہوتا ہے۔ تو اس وقت مجھے معلوم ہوتا ہے کہ خیالات مجھ میں بلا کسی سبب کے آرہے ہیں۔ میں خیالات کے آنے کا کوئی سبب نہیں ہوں بلکہ خیال کی لطیف موج کا متحیر تماشائی ہوں۔ یہ سچ ہے کہ میں ان کو خواہش سے اور متوجہ ہو کر دیکھتا ہوں اور میری حالت اس وقت انتظار کی حالت ہوتی ہے۔ مگر یہ یقینی ہے کہ یہ خیالات ایک نامعلوم قوت کے ذریعے آتے ہیں۔

گذشتہ اور حالیہ غلطیوں پر اعلیٰ تنقید، اور ان غلطیوں کی آگاہی کی صرف غیبی تنقید وہ فطرتِ عظیم ہے جو ہم کو اس طرح محیط کئے ہوئے ہے جیسے زمین کو کرۂ ہوا کی نرم آغوش۔ یہ وہ وحدت ہے یہ وہ روح اعظم ہے جس میں ہر شخص کا اصلی جوہر شامل ہے اور وہ سب میں

مشترک ہو کر ایک ہو گئی ہے۔ یہ وہ قلب عام ہے جس سے ہر مخلصانہ گفتگو عبادت ہے اور جس کے لئے ہر صحیح کام اطاعت ہے۔ یہ وہ کامل قدرت والی حقیقت ہے جو ہماری عیاریوں اور دانتوں کا راز کھول دیتی ہے اور جو ہر شخص کو ویسا ہی بناتی ہے جیسا اس کا اقتضا ہے اور اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ ہر شخص اپنے آپ کو جس کام کے لئے پیش کرے وہ عملی طور پر کرے۔ بناوٹ کا اس میں شائبہ تک نہ ہو اور جو (روح) ہمیشہ ہمارے افکار و اعمال میں روز افزوں داخل ہوتی رہتی ہے اور دانشمندی، نیکی، قوت اور حسن و جمال بخشتی ہے۔ انسانی ہستیاں اگرچہ جدا جدا اور ان کا ہر فرد الگ الگ ہے مگر ساتھ ہی اس کے انسان کی ذات میں ساری کائنات کی روح ساری ہے۔ وہ عاقلانہ وقار ہے، وہ عام حسن و جمال ہے جس سے ہر جزو اور ہر ذرہ مساوی حیثیت سے متعلق ہے اور وہ ہی لازوال واحد ہے۔ اور یہ اعلیٰ قوت جو ہم کو محیط کئے ہوئے ہے اور جس کی تمام خوبیوں سے ہم متمتع ہو سکتے ہیں، وہ نہ صرف قائم بالذات اور جامع کمالات ہے بلکہ اس کے لئے یہاں تک کہا جاتا ہے کہ نظر

اور منظور، شاہد اور مشہود، فاعل اور مفعول سب ایک ہیں۔ ہم دنیا کو جزو اجزاء دیکھتے ہیں، مثلاً سورج، چاند، جانور، درخت، مگر تمام دنیا جس کی یہ سب چیزیں روشن اجزاء ہیں، وہ روح ہے۔ صرف اعلیٰ عقل کل کے مشاہدہ سے ہم تمام زمانہ کی باتیں معلوم کر سکتے ہیں، اور اسی بہترین خیالات پیدا ہونے سے اور اس آواز غیبی کی روح کے آگے سرنگوں ہونے سے جو ہر شخص کی فطرت میں موجود ہے، ہم جان سکتے ہیں کہ وہ کیا کہتی ہے۔ جو شخص اس حالت پر آ جائے تو اس کی باتیں اس شخص کو جس کے خود ایسے خیالات نہیں ہوتے لاحاصل معلوم ہوتی ہیں۔ میں اس کے متعلق لکھنے کی جرأت نہیں کرتا اس لئے کہ میرے الفاظ اس کا پاکیزہ مفہوم ادا نہیں کرتے ہیں وہ الفاظ پست اور بے اثر رہ جاتے ہیں۔ صرف روح ہی جس کو چاہے ایسی قوت گویائی عطا کر سکتی ہے۔ اور یہ بھی خیال رکھنے کی بات ہے کہ ان کی گفتگو شستہ ہوتی ہے، وہ شیریں اور بہت جامع ہوتی ہے۔ تاہم میری خواہش یہ ہے کہ میں روح کو ان چیزوں کا بیان، اگر مقدس الفاظ میں نہ ہو سکے تو غیر مقدس سادہ الفاظ سے

ذریعے سے کروں اور یہ ظاہر کروں کہ میں نے اس قانونِ اعظم کے بارے میں اس کی عظمت کی سادگی اور ذہانت کے متعلق کیا کیا نکات جمع کئے ہیں۔

اگر ہم غور کریں کہ گفتگو کے وقت ہماری کیا حالت ہوتی ہے، خواب بیداری، عالمِ تاسف کے دوران میں ہم پر کیا گذرتی ہے۔ جذبہ کے وقت اور خواب کی حالت میں ہماری کیا کیفیت ہو جاتی ہے تو ہم کو ان میں بہت سے ایسے نکات ملیں گے جو فطرت کے پوشیدہ علم میں وسیع اور پُر از معلومات ہو جائینگے۔ ان حالتوں اور ان واقعات میں ہم اکثر دوسرے مجالس میں جلوہ گر ہوتے ہیں مگر عجیب عجیب ہماری کسی حقیقی کیفیت یا حالت کو سرفہ اٹھا کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ خواہ مخواہ ان کی طرف توجہ کھینچ جائے ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی روح کوئی حواس نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی چیز ہے جو تمام حواسوں کو متحرک کرتی اور ان کو کام میں لگاتی رہتی ہے۔ وہ قوتِ یاد، قوتِ حساب، قوتِ متخیلہ کی مانند کوئی قوت نہیں ہے بلکہ وہ ان کو اپنے ہاتھ اور پیر

کی مانند کام میں لاتی ہے۔ وہ کوئی ملکہ ہے بلکہ روشنی ہے۔ وہ ذہانت یا مرضی نہیں ہے بلکہ ذہانت اور مرضی کی مالک ہے۔ جس پر ہماری ہستی کا دارومدار ہے وہ اس کی پشت پناہ ہے۔ یعنی وہ ایک غیر مقبوضہ کثرت ہے اور نہ اس کثرت پر کبھی قبضہ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے اندر یا عقب سے ایک روشنی تمام چیزوں پر پڑتی ہے جس سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ہستی کی کوئی حقیقت نہیں ہے، جو کچھ ہے یہ ہی روشنی ہے۔ انسان ایک مندر کا بیرونی حصہ ہے جس میں تمام دانشمندی اور نیکی مرکوز رہتی ہے۔ جس کو ہم عام طور پر انسان کہتے ہیں، وہ کھاتا ہے، پیتا ہے، بوتا ہے، گنتا ہے۔ ہمیں چونکہ معلوم ہے کہ وہ ان باتوں میں اپنی ذات کی نمائندگی کرتا ہے مگر غلط کرتا ہے۔ ہم انسان کی عزت نہیں کرتے بلکہ روح کی عزت کرتے ہیں جس کا انسان مظہر ہے۔ اگر وہ اپنی روحانی خوبیوں کو اپنے افعال سے ظاہر کرے تو اس حالت میں وہ واجب التعظیم ہوگا جب روح عقل کو مظہر بناتی ہے تو اس کو ہم فراست کہتے ہیں جب روح قوت ارادے کے ذریعہ سے ظاہر ہوتی ہے تو وہ نیکی کہلاتی ہے۔

جب وہ محبت سبب جذبہ کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہے تو محبت کہلاتی ہے
اگر عقل خود مختار اور قایم بالذات ہونے کی کوشش کرے تو اُس وقت
سے وہ محض پیدا شدہ شے ہے۔ اور عقل کی کمزوری اُس وقت سے
شروع ہوجاتی ہے جب کوئی انسان خودی کا دعوی کرے۔ جب
ہم کوئی اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو اس سے ہمارا یہ مقصد ہوتا ہے کہ روح
کو کسی نہ کسی رنگ میں اپنے ذریعہ سے ظاہر کیا جائے دوسرے الفاظ
میں اسکا مطلب یہ ہے کہ روح ہم سے کوئی کام کرائے۔

ہر انسان کو بعض وقت اس خاص فطرت کا احساس ہوتا ہے
زبان اس کی تصویر کھینچنے سے عاجز ہے۔ اس وجہ سے کہ یہ بہت لطیف
چیز ہے۔ حالانکہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ یہ ہم کو محیط کئے ہوئے ہے اور ہم
میں مشترک ہے مگر پھر بھی ہم نہ اس کی تشریح کر سکتے ہیں اور نہ اسکو
حساب کے ذریعہ معلوم کر سکتے ہیں۔ یہ ہمیں معلوم ہے کہ تمام روحانی
قوت انسان ہی میں موجود ہے۔ کسی کا کیا اچھا قول ہے کہ "خدا نامعلوم
طریقے سے حاضر و ناظر رہتا ہے"۔ جب ہم آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہیں تو
آنکھوں اور آسمان کے درمیان کوئی حجاب اور کوئی چیز حائل نظر

نہیں آتی اسی طرح جب روح خدا سے رجوع کرتی ہے تو روح اور خدا کے درمیان کوئی حجاب نہیں رہتا۔ تمام حجابات پہلے ہی اٹھا لئے جاتے ہیں۔ جس طرح ہمارے اور آسمان کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے۔ انصاف کو ہم دیکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ کیا چیز ہے اسی طرح ہم محبت، آزادی اور طاقت کو بھی دیکھتے ہیں اور ہمیں ان کا علم ہے۔ ان فطرتی چیزوں پر کبھی کوئی شخص غلبہ نہ پا سکا بلکہ یہی چیزیں ہم پر چھائی ہوئی ہیں اور جب ہمارے مفاد، ان محاسن کی خلاف ورزی کی ہمیں ترغیب دلاتے ہیں تو اتنی ہی قوت اور غلبہ کے ساتھ یہ چیزیں ہم پر محیط ہو جاتی ہیں۔

اس قسم کی روحانیت کا غلبہ جس کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں اس وقت بتایا جا سکتا ہے جب ہم ان پابندیوں سے آزاد ہو جائیں جو ہم کو ہر طرف سے محیط کئے ہوئے ہیں۔ روح تمام چیزوں پر چھائی ہوئی ہے۔ جیسا میں کہہ چکا ہوں کہ اس کے خواص، مادیت سے بالکل متضاد ہیں اسی طرح وہ زمان و مکان سے بھی مستغنی ہے۔ اکثر آدمیوں میں پایا جاتا ہے کہ حیات سے اتنے اُن کی روح تو اس

حد تک مغلوب کر لیا ہے کہ زمان و مکان کی بندشیں اُن کو زیادہ حقیقی اور وسیع نظر آتی ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے نزدیک دنیا میں ان بندشوں کو بے حقیقت سمجھنا دیوانگی کی علامت ہے۔ بایں ہمہ زمان و مکان روح کی قوت کی الٹی میزانیں ہیں۔ روح کے سامنے وقت بے حقیقت شئے ہے۔

ہم کو اکثر محسوس کرایا جاتا ہے کہ اس جوانی اور عمر کی یہ نسبت جس کا ہم اپنی پیدائش کے وقت سے حساب لگایا کرتے ہیں ایک اور بھی جوانی اور عمر ہے۔ بعض خیالات ہم کو ہمیشہ جوان پاتے ہیں اور ہم کو جوان رکھتے ہیں۔ مثلاً لازوال اور کائنات کی خوبصورت چیزوں کی محبت اس قسم کا خیال ہے۔ اس پر غور کرنے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ جذبہ انسانی زندگی کے محدود وقفہ سے نہیں بلکہ لکھو کھا برسوں سے تعلق رکھتا ہے۔ ذہنی قوت کی کم سے کم سرگرمی بھی ہمیں ایک گونہ وقت کی پابندیوں سے آزاد کر دیتی ہے۔ بیماری یا نقاہت کی حالت میں ہمیں کسی نظم کا دلچسپ مصرعہ یا پرمعنی فقرہ پڑھنے کے لئے ویدو یا ان لئے نام کی

یاد دلادو تو فوراً ہم پر ایک ایسا جذبہ طاری ہو جائے گا جس سے ہم کو ان کی بقائے و دوام کا احساس ہوتا ہے۔ خیال کرنے کا مقام ہے کہ لطیف اور بلند خیال کس طرح صدیوں اور ہزار ہا برسوں کو گھٹا دیا کرتا ہے اور ہر زمانہ میں کس طرح نمودار ہو جایا کرتا ہے کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کے اثر میں اب بہ نسبت اس وقت کے کچھ بھی کمی ہوئی ہے جب آپ نے اپنی زبان سے ارشاد فرمائی تھی؟ میرے خیال میں واقعات اور شخصیت کے زور کا تعلق وقت سے نہیں ہے۔ اور اس لئے روح کی میزان ہمیشہ ایک ہی ہوتی ہے مگر جسمانیت کی میزان دوسری ہوتی ہے۔ روح کے غلبہ کے مقابلہ میں زمان و مکان اور مادیت معدوم ہو جاتی ہیں۔ جس طرح ہم ستاروں کی کثرت کو مقعر آسمان سے منسوب کرتے رہتے ہیں اسی طرح ہم واقعات کو وقت سے متعلق کیا کرتے ہیں اور اسی طرح ہم قیامت کے قرب و بعد کے متعلق بھی کہہ دیا کرتے ہیں کہ لکھو کھا سال کی دوری کا وہ دن جس کے متعلق بذریعہ وحی اطلاع دی گئی ہے قریب ہے۔ اسی طرح ہم یہ بھی کہتے رہتے ہیں کہ کسی سیاسی اخلاقی

تمدنی، معاشرتی اصلاحوں کا دن قریب ہے وغیرہ وغیرہ۔ جب ہم کسی واقعہ کے متعلق غور کرتے ہیں تو اس واقعہ میں دو حیثیتیں ہوتی ہیں، ایک کی رفتنی و گذشتنی یا فانی حیثیت ہوتی ہے اور دوسری حیثیت غیر متبدل ہوتی ہے اور اس کی اہمیت ایسی ہوتی ہے جیسی روح کی۔ یہ چیزیں جنکو ہم اب غیر متبدل سمجھتے ہیں، یکے بعد دیگرے ہمارے حیات سے خود بخود اس طرح جدا ہوتی جائیں گی جس طرح پکے ہوئے پھل ایک ایک کرکے خود بخود گرتے رہتے ہیں۔ خدا جانے ان کا پھر کیا حشر ہوگا۔ کشادہ میدان، چلتی پھرتی صورتیں، لندن، بوسٹن، یہ سب موجودات ہیں اور ایسی روا روی کی حالت میں ہیں جیسے کوئی منظیم یافتہ چیز ہوتی ہے، یا ان کی ایسی حالت ہے جیسے کہر یا دھوئیں کی ہوتی ہے اور یہی حالت سوسائٹی اور دنیا کی ہے۔ روح نہایت سرعت سے چلی جارہی ہے اپنے پیچھے بہت سی جیتی جاگتی دنیا چھوڑتی جاتی ہے اور اپنے آگے نئی دنیا بساتی جارہی ہے۔ اس کے ساتھ نہ کوئی تاریخ ہے نہ کوئی حق ہے نہ کوئی شخصیت ہے، نہ کوئی خصوصیات ہیں اور نہ کوئی آدمی ہے

روح صرف روح کو جانتی ہے، واقعات کا جبالا وہ اوڑھا ہوا لبادہ ہے جس کو وہ زیب تن کیے ہوئے ہے۔

اس کی ترقی کی رفتار فن ریاضی کے حساب سے نہیں بلکہ اسی کے خاص مقرر کردہ قانون سے شمار کی جاسکتی ہے۔ روح کی ترقی درجہ بدرجہ نہیں ہوتی جیسے ایک خطِ مستقیم میں اس کی نقل وحرکت کی مثال دے سکیں۔ بلکہ غالباً اس کو مادہ کی حالت کی تدریجی ترقی سے مثال دے سکتے ہیں۔ یعنی جیسے مادہ درجہ بدرجہ ترقی کرکے کیڑا ہوجاتا ہے اور کیڑا ترقی کرتے کرتے مکھی ہوجاتا ہے۔ فراست کی ترقی کی رفتار مجموعی طور پر عمل میں آتی ہے۔ اس کی ترقی منتخب افراد یعنی عمرو بکر اور زید سے متعلق نہیں ہے جس کی وجہ سے لوگ اس کی یکبارگی ترقی کی بنا پر اس سے حسد کرسکیں بلکہ اس کی ترقی کی ہر جست سے انسان کی نظر اس کام میں جس کو وہ کررہا ہے نہایت وسیع ہوجاتی ہے اور ہر ضرب میں وہ گنجان آبادیوں سے، فرقوں سے، اور لوگوں کی بڑی بڑی جماعتوں سے ایک دم فوقیت لیجاتا ہے۔ معرفت کی راہ کی ہر منزل پر اس کا دماغ

محدود اور مرئی حدود کو توڑتا چلا جاتا ہے لازوال حدود میں داخل ہو کر راست اُس کا خدا سے تعلق ہو جاتا ہے۔ پھر اس حالت میں وہ ان صداقتوں سے واسطہ رکھتا ہے جو زینو اور ایریان کی تھیں یعنی یہ کہ وہ ان لوگوں کی بہ نسبت جو اس کے گھر میں اس کے ساتھ رہتے ہیں ان لوگوں کا ہم خیال ہو جاتا ہے۔

یہ قانون دل و دماغ کی ترقی کا ہے۔ ایک خاص قسم کی سہولت کے ساتھ تمام نیکیوں کے طبقہ تک انسان بلند ہو جاتا ہے نہ یہ کہ اس کی ترقی کسی خاص ایک نیکی تک ہوتی ہے کیونکہ نیکیاں انسان کی روح میں ہیں جو اُن سب کی جامع ہے۔ مثلاً روح کا لازمہ پاکیزگی ہے مگر وہ (روح) محض پاکیزگی ہی نہیں ہے۔ انصاف اس کا لازمہ ہے مگر وہ فقط انصاف نہیں ہے۔ لطف و کرم اس کا لازمہ ہے مگر وہ اس سے بھی ماورا ہے۔ چنانچہ اگر ہم کسی جامع اخلاق طبیعت کا ذکر چھوڑ کر اس کی بجائے کسی ایک خوبی پر زور دیں جو انھیں اخلاق میں داخل ہے تو یہ ایک قسم کا تنزل اور تسلیح معلوم ہوتا ہے۔ وہ توانا اور تندرست بچہ جو ابھی پیدا ہوا ہو،

اس میں نیکیاں فطرتی ہوتی ہیں، یہ نیکیاں وہ محنت اور تکلیف اٹھا کر حاصل نہیں کرتا۔ آدمی کے دل کو مخاطب کرو اور وہ متاثر ہوتے ہی مجموعی طور پر نیک بن جائیگا۔ (اور الگ الگ ایک ایک نیکی سکھانے کی ضرورت نہ ہوگی۔)

ذہنی ترقی کا آغاز بھی ایسے ہی خیال کے تحت میں ہے اور جو اسی قانون کا پابند ہے۔ جن لوگوں میں خاکساری، انصاف، محبت، جائز تمناؤں کے جذبات پائے جاتے ہیں، وہ ہی لوگ سب سے پہلے بڑا رتبہ پاکر سائنس، صنعت میں کمال حاصل کرتے ہیں، تقریر اور نظم پر قابو حاصل کرتے ہیں، عمل اور لطف انھیں کا حصہ ہوتا ہے۔ کیونکہ جو لوگ ان اخلاقی خوبیوں سے آراستہ ہوتے ہیں تو ان لوگوں میں ایسی خوبیاں جو قابل قدر سمجھی جاتی ہیں قدرتی طور پر پیدا ہو جاتی ہیں اور انھیں خوبیوں کی لوگ بڑی بڑی تعریفیں کیا کرتے ہیں۔ عاشق میں کوئی خوبی ایسی نہیں ہوتی جو اس کی محبوبہ پر اثر کئے بغیر رہ سکے خواہ اس کی دلربائیں وہ ہی خوبیاں کتنی ہی کم کیوں نہ ہوں اور وہ دل جو عقل اولین کا ہو جاتا ہے تو

وہ اس کی (عقل کل کی) ہر قسم کی قوتیوں سے منسوب و متمتع ہو جاتا ہے اور پھر اس کے لئے خاص قسم کی روحانی قوتیں اور علوم روز روشن ہو جاتے ہیں۔ اس ابتدائی اور بنیادی تعلیم کو حاصل کرنے میں گویا ہم مرکز سے دور تھے مگر اب ہم مرکز پر آ گئے ہیں جہاں سے ہم اسباب و علل کا پتہ لگا سکتے ہیں اور ساری کائنات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

خدائی تعلیم دینے کی ایک صورت یہ ہے کہ روح کو کسی پیکر میں پیدا کیا جائے ایسا ہی پیکر جیسا کہ میرا ہے۔ میں لوگوں میں رہتا ہوں اور وہ ایسے افراد ہیں جو میرے ذہنی خیالات کے مطابق خود بھی احساس رکھتے ہیں یا ان وجدانی جذبات کی متابعت کرتے ہیں جو مجھ میں موجود ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ قوت اعلیٰ ان لوگوں کو بھی محیط ہوئے ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ میری ہستی ایک جداگانہ ہستی ہے۔ اور وہ ہستیاں جن کے میرے ہی جیسے خیالات ہیں مجھے اپنی طرف ایسا متوجہ کرتی ہیں کہ اور کوئی چیز نہیں کر سکتی اور پھر یہ ہی ہستیاں مجھ میں نئے جذبات کو متحرک کر دیتی ہیں اور

وہ جذبات یہ ہیں جن کو ہم غصہ، محبت، نفرت، خوف، تعریف اور رحم کہتے ہیں اور بعدہٗ ایسے جذبات پیدا کرتی ہیں جن کو ہم گفتگو، رقابت، تعاقب، غصہ اور جنگل کہتے ہیں۔ روح کی ابتدائی تعلیم لوگوں ہی میں پائی جاتی ہے۔ جوانی میں ہم دیوانوں کی طرح لوگوں کی جستجو میں رہتے ہیں۔ بچپن، جوانی حتیٰ کہ تمام دنیا ان میں پائی جاتی ہے۔ لیکن جتنا آدمی کا تجربہ بڑھتا جاتا ہے وہ ان سب کی مشترکہ فطرت کی یگانگت کو محسوس کرتا جاتا ہے۔ وجود ہی سے ہم کو عدم وجود کا پتہ چلتا ہے۔ دو آدمی بات چیت کر رہے ہوں تو وہ ایک تیسری ہستی کا جو فطرت عام ہے ضمنی حوالہ دیا کرتے ہیں وہ کوئی ہستی نہیں ہے انسان نہیں ہے بلکہ خدا ہے۔ اور اسی طرح لوگوں کی جماعت میں جہاں خصوصاً کسی اعلیٰ خیال پر سرگرم مباحثہ ہو رہا ہو تو بحث کی گرما گرمی میں جماعت کا ہر شخص اس سے آگاہ ہو جاتا ہے کہ ہر شخص کے دل میں وہ ہی خیال جس پر بحث ہو رہی ہے مساوی حیثیت سے موجزن ہوتا ہے اور یہ کہ جو کچھ کہا گیا ہے اس پر جیسا روحانی حق کہنے والے کو حاصل ہے ویسا ہی سب کو ہے

تمام لوگ پہلے سے زیادہ صاحبِ فہم ہو جاتے ہیں۔ وہ خیال ان کے اوپر حاوی ہو جاتا ہے۔ ہر شخص میں ایک ہی قسم کی قوت اور فریضہ کا احساس پیدا ہو جاتا ہے اور ہر ایک ہستی غیر معمولی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ غور و فکر کرتی اور اس پر عمل پیرا ہوتی ہے۔ ہر شخص کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس نے اس خیال کی بنا پر اس سے بھی اعلیٰ قسم کا اپنے اوپر قابو حاصل کر لیا ہے۔ وہ خیال ہر شخص کو اچھی اچھی باتیں سکھاتا ہے۔ دنیوی امور میں ایک قسم کی دانشمندی ہوتی ہے جو عموماً بڑے آدمیوں اور چھوٹے درجہ کے لوگوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے اور جس کو ہماری معمولی تعلیم اکثر برباد کر دیتی ہے اور اس کی نشوونما کو روک دیتی ہے۔ ہر شخص کی طبیعت ایک ہی سی ہوتی ہے اور نہایت اچھی طبیعت رکھنے والے لوگ جو سچائی کی صداقت کی وجہ سے عزت کرتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ سچائی میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ وہ سچائی کو ہر قسم کی شکر گزاری کے ساتھ قبول تو کر لیتے ہیں مگر وہ کسی آدمی کے ساتھ اسے مخصوص نہیں کرتے اس وجہ سے کہ یہ پہلے سے اور روزِ ازل سے ان کے

ساتھ چلی آرہی ہے۔ کوئی عالم ہو یا کسی خیال کا ماہر ہو غرض کوئی ہو دانشمندی صرف انھیں کے حصہ میں نہیں آئی ہے۔ اُن کے خیال کی روانی کا زور ان کو اس قابل نہیں رکھتا کہ وہ ٹھیک ٹھیک سوچ سکیں۔ جو لوگ سمجھدار اور تیز فہم نہایں ہیں وہ بے تکی باتیں کہدیا کرتے ہیں اور ایسی باتیں جن کی ہمیں مدت سے ضرورت ہوتی ہے اور جن کے حصول کے لئے ہم عرصہ سے بیفائدہ کوشش کر رہے ہوں حق تو یہ ہے کہ ہمیں ان ہی لوگوں سے بہت سی قابل قدر باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ روح کا اس قسم کا فعل بہ نسبت ان باتوں کے جو گفتگو میں بولی جاتی ہیں بیشتر ان باتوں میں محسوس کیا جاتا ہے جن کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ روح کا یہ فعل سوسائٹی میں موجود رہتا ہے مگر لوگ بلا امتیاز ایک دوسرے میں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ جو کچھ ہم کرتے ہیں اس سے زیادہ جانتے ہیں مگر اس کے باوجود بھی ہم نے اپنے اوپر قابو نہیں پایا ہے اور ساتھ ہی اس کے ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہم بہت کچھ ہیں۔ مجھے اس بات کی صداقت کا احساس اکثر اپنے ہمسایہ سے معمولی بات چیت کرنے سے ہو جاتا ہے۔ یہ احساس کہ

ہم میں کوئی برتر قوت اس بازیچہ اطفال کو دیکھ رہی ہے اور گویا ہم سب کے پشت پر سے ایک دیوتا دوسرے دیوتا سے اشارے کر رہا ہے۔

میل جول کے لئے انسان کو اپنے رتبے سے اترنا پڑتا ہے جس طرح شیوخ عرب بہت ہی چھوٹے چھوٹے گھروں میں رہتے ہیں اور اپنے آپ کو بہت ہی غریب ظاہر کرتے ہیں تاکہ وہ بادشاہ کے استبداد سے بچ سکیں اور اسی غرض سے وہ اپنی دولتمندی کا اظہار نہیں کرتے بلکہ اس کو اندرونی اور محفوظ مواقع تک محدود اور مخصوص رکھتے ہیں اسی طرح انسان اپنی جبلی شرافت کو پس پشت ڈال کے دنیا کی معمولی خدمت انجام دینے کے لئے انکساری اختیار کر لیتے ہیں۔

جس طرح یہ بات تمام لوگوں میں پائی جاتی ہے اسی طرح زندگی کی ہر منزل میں بھی موجود رہتی ہے۔ چنانچہ یہ بات بچوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ اپنے بچے کے ساتھ کسی کام کے متعلق جو میرا برتاؤ ہوتا ہے اس برتاؤ میں میری لیٹن اور یونانی زبانوں

کی سحر کاری سے اس کی ضروریات کو پورا کرنے کے وعدوں سے
روپیہ پیسے کی امداد سے میرے حسب منشا، اتنا کام نہیں نکلتا جتنا میں
اپنی روحانی قوتوں کی امداد سے کام نکال سکتا ہوں۔ اگر میں اس
سے کسی کام کے کرانے کا مصمم ارادہ رکھتا ہوں تو اس کا عزم کیے
بعد دیگرے میرے خلاف ہوگا۔ اس صورت میں اگر میں چاہوں تو
اپنے عزم کو منوانے کے لئے اپنی طاقت کی زیادتی کام میں لاکر
اور اس کو سزا دے کر اپنے دامن پر ذلت کا دھبہ لگا سکتا ہوں۔
لیکن اگر میں اپنے ارادے کو ترک کردوں اور روح کی مرضی پر
کاربند ہوکر چلوں اور اسکو (روح کو) دونوں کے درمیان ثالث
مقرر کردوں تو اس صورت میں وہ مجھ سے محبت کرنے لگتا ہے اور
میری عزت کرتا ہے۔

روح سچائی کو پرکھنے اور بے نقاب کرنے والی شئے ہے جب
ہم کو صداقت سے واسطہ پڑتا ہے تو ہمیں معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ صداقت
ہے۔ اس صداقت کے متعلق منکر اور کافروں کا جو کچھ خیال ہے اسکو
ہونے دو۔ بیوقوف لوگ جب سچ بات کو سننا نہیں چاہتے تو غوغا

کہا کرتے ہیں کہ "یہ تمھیں کیونکر معلوم ہوا کہ یہ بات سچ ہے ممکن ہے کہ یہ تمھاری غلطی ہی ہو"۔ جب ہمارا سچائی سے واسطہ پڑتا ہے تو ہم اس میں اور اپنی رائے میں امتیاز کر سکتے ہیں۔ بالکل اسی طرح یعنی یہ کہ جب ہم بیدار ہیں تو یقیناً بیدار ہیں۔ ایمنویل سویڈن برگ کا یہ بڑا قابلِ تعظیم فقرہ تھا جس سے اس مشہور و معروف شخص کا ادراک ظاہر ہو گا" یہ بات کہ کوئی شخص جس بات کی چاہے اس کی تصدیق کرے مگر یہ اس شخص کی سمجھ کا ثبوت نہیں ہے بلکہ اس کو چاہئے کہ جو بات سچ ہے اس کو سچ جانے اور جو بات غلط ہو اسے غلط سمجھے اور یہ امر اس کی فراست کی دلیل ہے"۔ سویڈن برگ کے اس فقرے پر غور کرنے سے روح کی حقیقی تصویر سیدھے ذہن میں کھینچ جاتی ہے جس طرح ہر سچی بات کا نقشہ دل میں کھنچ جایا کرتا ہے۔ اس خیال میں جو برا خیال ہوتا ہے اس کو وہی روح برا جان کر تلوار کی طرح کاٹ کر پھینک دیتی ہے۔ ہم جتنا جانتے ہیں اس سے زیادہ عقلمند ہیں۔ اگر ہم اپنے خیال میں دخل دہی نہ کریں بلکہ اس کو قطعی اس کی مرضی پر چھوڑ دیں یا یہ دیکھیں کہ یہ خیال خدا کے ساتھ کیا علاقہ رکھتا ہے

تو ہم کو خاص بات معلوم ہو جائے گی اور ہر چیز اور ہر شخص کی سیرت کیونکہ خالق ارض و سما ہر جگہ موجود ہے اور اس کی وحدت کا پر تو ہم میں سے گزر کر ہر چیز کو منور کرتا رہتا ہے۔

لیکن شخصی زندگی کے خاص خاص واقعات اور تجربے کے موقعوں پر اس طرح اپنے آپ کو شناخت کرنے کے علاوہ، وہ (روح) حق و صداقت کا انکشاف بھی کرتی ہے اور اس موقع پر ہمیں چاہئے کہ محض اس کی موجودگی سے اپنے آپ کو تقویت پہنچانے کی کوشش کریں اور ایسے انکشاف کے وقت اس صداقت کا اظہار زیادہ عمدہ اور اعلیٰ پیرائے میں کریں کیونکہ روح کا صداقت سے ہم کلام ہونا فطرت کا سب سے مہتم بالشان واقعہ ہے اس لئے کہ اس وقت صداقت صرف اپنا جزو ہم کو نہیں دیتی بلکہ کلیتاً اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دیتی ہے یا اس آدمی میں حلول کر جاتی ہے جس کو اس نے مستفید کیا ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ جس نسبت سے آدمی اس صداقت کو حاصل کرتا ہے اسی قدر وہ صداقت انسان کو اپنا بنا لیتی ہے۔

ہم روح کی اطلاعات کو یعنی اس کی ذاتی فطرت کے ظہور کو الہام کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ الہام کے ساتھ ہی ہمارے اوپر نہایت ارفع جذبات طاری ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ الہام اس آمد کا نام ہے جو ذاتِ الٰہی جل سلطانہٗ سے ہمارے نفس پر وارد ہوتی ہے۔ یہ عالم کائنات کی طوفانی موج ہے جس کے سامنے تشخصی چشمہ دب جاتا ہے۔ ان الہامی احکام کا ہر واضح یقین انسان کو بیم و خوشی کے جذبات سے مضطرب کر دیتا ہے۔ نئی صداقت کے احساس کے وقت انسان کو ایک سنسناہٹ سی محسوس ہوتی ہے یا یہ حالت اس وقت بھی ہوتی ہے جب انسان کوئی بڑا کام کرتا ہے اور اس وقت یہ سنسناہٹ اس کی فطرت کی تہ سے رونما ہوتی ہے۔ الہام کی صورت میں قوتِ دید اور قوتِ عزم لازم و ملزوم ہوتی ہیں، البتہ یہ قوتِ دید تسلیم و رضا سے حاصل ہوتی ہے اور راضی برضا ہونے کا جذبہ مسرت انگیز انکشافات سے پیدا ہوتا ہے۔ نفسِ انسانی جس وقت الہام سے مغلوب ہو جاتا ہے اس وقت کا لمحہ اس کے لئے قابلِ دید ہوتا ہے۔ ہماری ماہیت کی ضرورت کے اعتبار سے اللہ عزوجل

کے حاضر و ناظر رہنے کا ایک قسم کا جوش انسان کے ادراک کو معلوم ہوتا رہتا ہے۔ یہ ہماری ماہیت کی فطرت ہے کہ اس زبانی حضور کے احساس سے نفس انسانی پر لازمی طور سے خاص قسم کا جذبہ پیدا ہوجاتا ہے۔ اس جذبہ کی نوعیت اور دیرپائی انسان کی حالت کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے یعنی بےخودی اور کیف ہوتا ہے اور کبھی ملہمانہ القا (جو شاذ واقع ہوتا ہے)۔ اور کبھی یہ جذبہ محض خفیف نکوئی کا جوش پیدا کر دیتا ہے اور اس کی یہ ہی صورت ہے جو ہمارے آتش خانوں کے مثل تمام خاندانوں اور جماعتوں کو گرمی پہنچاتی ہے اور انسانی تمدن کو ممکن بناتی ہے۔ مذہبی جذبہ پیدا کرنے کا کسی نہ کسی قسم کا میلان لوگوں میں ہمیشہ پایا گیا ہے جو جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ گویا اس جذبہ کی کثرت نے "ان کو حواس باختہ کر دیا تھا"۔ سقراط کی بیخودی، پلوطینس کا اتحاد، پورفری کا خواب، پول کا تبدیل مذہب کرنا، بہمن کے ساتھ طلوع سحر کا واقعہ، جارج فاکس اور اس کے کوئیکروں کا پیچ و تاب اور سویڈن برگ کی تحریریں، یہ سب اسی قسم کی مثالیں ہیں۔ وہ جذبہ جو ان مشہور و معروف آدمیوں

کے لئے بہترین خوشی کا باعث تھا عوام میں اس کی بیشمار مثالیں ملیں گی جن میں یہ جذبہ نہیں پایا جاتا۔ مذہب کی تاریخ میں ہر جگہ جوش کا میلان پایا جاتا ہے۔ فرقہ مرادیہ اور کویکسٹ فرقے والوں کا وجد، نئے کلیسائے یروشلم کی تعلیمات میں "کلمۃ اللہ" کے رموز کا انکشاف۔ کلمونی گرجوں کا احیاء اور فرقہ میتھوڈسٹ کے کوائف۔ یہ سب اسی خوف و مسرت کی مختلف صورتیں ہیں جو انسانی روح کی روحِ اعظم سے ارتباط و اختلاط کیساتھ وجود میں آئی ہیں۔

یہ سب ایک ہی قسم کے الہامات ہیں اور قانون حقیقی کے مظہر ہیں۔ ان سے خاص روح کے سوالات پر روشنی پڑتی ہے جس سوال کو انسانی عقل اٹھاتی ہے وہ اس کا جواب نہیں دیتے۔ روح الفاظ کے ذریعہ ان سوالات کا جواب نہیں دیتی بلکہ جس چیز کا سوال اٹھایا گیا ہے۔ یہی چیز اسکا جواب دیتی ہے۔

الہام روح کا مظہر ہوتا ہے۔ الہام کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ ان باتوں کو بتاتا ہے جو قسمت میں لکھی گئی ہیں۔ گذشتہ زمانے میں جو لوگ کہانت کرتے تھے ان کے الہام کا مقصود یہ

ہوتا تھا کہ مادیات کے متعلق مسائل کا جواب معلوم کریں اور خدا کی طرف سے یہ بتانے کا ذمہ لیں کہ انسان کتنے دن جئیں گے، ان کے ہاتھ کیا کیا کام کریں گے، ان کا کون کون ساتھی ہوگا، ان کے کیا کیا نام ہونگے، یہاں تک کہ کب اور کہاں۔ مگر ہم کو اس معاملہ میں جلدی نہ کرنی چاہیئے۔ ہمیں پہلے اس تھوڑی بہت دریافت کرنے کی خواہش کی روک تھام کر لینی چاہیئے۔ الفاظ میں اس کا جواب دینا مغالطہ میں پڑنا ہے۔ اس قسم کے سوالات کا حقیقت میں کوئی جواب نہیں ہے جن ممالک کو تم بحری سفر کے ذریعہ جارہے ہو اُن کی تفصیل نہ پوچھو۔ ان کی تفصیل تمھیں نہیں بتائی جاسکتی بلکہ تم وہاں خود پہنچ جاؤ گے اور اس جگہ رہ کر ان کو جان لوگے۔ انسان، روح کے غیر فانی ہونے کے متعلق، جنت کے کاروبار کے بارے میں، گنہگاروں کی حالت کی نسبت پوچھا کرتے ہیں اور اسی قسم کے بہت سے سوالات کرتے رہتے ہیں۔ وہ اس خیال خام میں بھی مبتلا ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان سوالات کے متعلق ٹھیک ٹھیک جواب دیا ہے۔ کبھی اُس مقدس ذات نے ایک لمحہ کے لئے بھی اس خلش میں رہ کر جس میں یہ لوگ

مبتلا ہیں گفتگو نہیں کی۔ صداقت، محبت، انصاف، اور روح کی صفات ایسی ہیں جن کا غیر متغیر ہونا سب کو تسلیم ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام جو ان جذبات عالیہ سے متکیف رہتے تھے اور ادنیٰ محسوسات سے بے پرواتھے، اور صرف انھیں اخلاقی صفات کے مظاہر پر توجہ فرماتے تھے انھوں نے ان صفات روح کے وجود اور ان کے بقا کے علیحدہ ہونے کا کبھی تصور بھی نہیں کیا نہ روح کی بقا کے متعلق کوئی حرف زبان سے نکالا۔ بلکہ یہ کام اُن کے مقلدین کے حصے میں آیا کہ وہ روح کی بقا کو اخلاق کی مخصوص باتوں سے علیحدہ کریں اور روح کی بقا کے مسئلہ کو ایک اصول قرار دیکر اس کی تلقین کریں اور اس کو دلائل سے تقویت دیتے رہیں۔ مگر روح کی بقا کے اصول کی جداگانہ تلقین کرنے سے پہلے ہی انسان اپنی اصلیت سے گرجاتا ہے۔ محبت کے جوش اور انکساری کی قدر کے متعلق استقلال کا کوئی سوال نہیں ہے۔ جس شخص کو اتقا ہوتا ہے وہ اس قسم کے سوالات ہی نہیں کرتا اور نہ ان دلائل کی طرف توجہ کرتا ہے۔ اس

۵۸۔ صداقت، محبت، انصاف وغیرہ۔ مترجم

وجہ سے کہ روح بجائے خود اپنے لئے ایک صداقت ہی اور جس شخص میں یہ حلول کی گئی ہے وہ اپنی موجودہ اصلی حالت سے جو غیر محدود ہے آنیوالی حالت کیطرف جو محدود ہے بھٹک نہیں سکتا۔

آنے والے زمانے کے متعلق جو سوالات ہم نہایت شوق سے کیا کرتے ہیں یہ حقیقت میں ایک قسم کے گناہوں کے اعتراف ہیں۔ خدا کے پاس ان سوالات کا کوئی جواب نہیں ہے۔ اس قسم کے سوالات کا الفاظ میں کوئی جواب نہیں دیا جاسکتا۔ مستقبل کے متعلق ہماری لاعلمی اللہ عزوجل کے مشیت کی ماتحت نہیں ہے بلکہ یہ بات انسان کی فطرت ہی میں پائی جاتی ہے کہ کل کے آنیوالے واقعات پر لاعلمی کا پردہ پڑا رہے۔ اس وجہ سے کہ روح نے اس کے متعلق ہمیں علت و معلول کے سوا، اور کچھ نہیں بتایا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ اسی لاعلمی کے نقاب کی بنا پر جو واقعات کے درمیان حائل رہتا ہے انسان کی زندگی کا انحصار ہے۔ اس قسم کے عقلی سوالات کی جواب ملنے کا صرف یہ ایک طریقہ ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ درجے کی استفسار کی خواہش کو ہم بھول جائیں اور اس بھاؤ پر پڑ لیں جو ہم کو رمو تہ

فطرت کی طرف لیجاتا ہے۔ یعنی یہ کہ "جیسے جی کام کئے جائیں ۔ کئے جائیں" اور ہم دیکھیں گے کہ آگے بڑھنے والی روح نے اپنے واسطے ایک نئی حالت پیدا اور قایم کرلی ہے اور یہاں سوال وجواب دونوں ایکسا ہوجاتے ہیں۔

اسی آگ سے جو طاقت بخش ظاہر بنانے والی اور باقی ہے اور اس وقت تک برابر فروزاں رہتی ہے جب تک کہ ہر شئے کو دریائے نور کی موجوں اور لہروں میں تبدیل نہ کردے۔ اسی آگ سے ہم ایک دوسرے کو دیکھتے پہچانتے اور اس کی روحانی قوت کا اندازہ کرتے ہیں۔ اپنے دوستوں کے حلقے میں - مختلف افراد میں سے ہر فرد کی سیرت کو جاننے کے اسباب کون بتا سکتا ہے؟ کوئی نہیں۔ تاہم ان کے افعال و اقوال کی بنا پر وہ ان کی سیرت کو جاننے سے محروم بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ کسی شخص کا جس کی کسی قسم کی برائی کا ہمیں علم نہ ہو ہم اس پر اعتماد نہیں کرتے۔ کسی دوسرے شخص میں جس سے ہم شاید ہی کبھی ملے ہوں اس قسم کی یقینی علامتیں ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ ہم اس پر اعتماد کرسکتے ہیں کیونکہ اسے خود اپنی سیرت کا پاس و لحاظ

ہے۔ ہم ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں یعنی یہ کہ ہم میں سے کون اپنے نفس کا سچا حق گزار ہے اور یہ کہ ہم اس چیز کی نصیحت کرتے ہیں یا سنتے ہیں کہ آیا وہ ایک خیالی منصوبہ ہے یا درحقیقت عملاً بھی ہم اس قسم کی کوشش کر رہے ہیں۔

ہم سب کے سب لوگ روحوں کو پرکھنے والے ہیں۔ روح کے جانچنے کی بڑی قوت ہماری زندگی یا ہمارے قوائے باطنی میں پوشیدہ ہے۔ سوسائٹی کے روابط، اس کی تجارت، اس کا مذہب، اس کی دوستی، اس کے جھگڑے۔ یہ سب باتیں سیرتِ انسانی کی اچھی تجارتی عدالتی تحقیقاتیں ہیں۔ بھری عدالت میں یا یہ کہ کسی چھوٹی سی جماعت میں، یا اس جگہ جہاں مدعی اور مدعا علیہ آمنے سامنے ہوں، آدمی اپنے آپ کو رائے لگانے کے لئے پیش کیا کرتے ہیں۔ اس میں اُن کی بلامرضی اس قسم کی صریح حرکات ظاہر ہو جاتی ہیں جن سے ان کی سیرت پر روشنی پڑتی ہے۔ لیکن یہ معلوم کرنے والا کون ہے؟ وہ کس چیز کے متعلق رائے لگاتا ہے؟ یہ ہماری فہم نہیں ہے۔ ہم ان باتوں کو اپنے علم اور ہنرمندی سے بھی نہیں جان سکتے نہیں

بلکہ عقلمند آدمی کی دانشمندی اس بات میں مرکوز رہتی ہے کہ وہ ان کی جانچ نہیں کرتا بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنی حرکات و سکنات کی خود جانچ کر کے اپنے متعلق کوئی فیصلہ کریں اور حقیقت میں وہ محض اسی فیصلہ پر غور کرتا ہے۔

اس ناگزیر فطرت کی رو سے' انسان کی ذاتی مرضی اس پر غالب آجاتی ہے اور ہماری کوششوں اور خامیوں کو بیکار کر دیتی ہے۔ یعنی تمھاری فراست تم سے ظاہر ہوگی اور میری مجھ سے۔ ہم میں جو کچھ قابلیت ہے وہ خود بخود نہیں بلکہ ہم سے بلا ارادہ ظاہر ہو جائے گی خیالات ہمارے ذہن میں ایسے راستے کے ذریعہ سے آتے ہیں جس کا ہمیں مطلق علم نہیں ہے اور خیالات ہمارے ذہن سے ایسے راستے کے ذریعہ سے جاتے ہیں جس کی ہمیں مطلق خبر نہیں ہے۔ سیرت ہماری فہم و فراست کے ماورا ہو کر ہم کو تعلیم دیتی ہے۔ سچی ترقی کی صحیح دلیل انسان کی اس طرز میں مرکوز رہتی ہے جس کو وہ اختیار کرتا ہے۔ اپنی اصلی حالت سے ممتاز حالت پر ترقی کرنے کیلئے اس کو نہ اس کی عمر روک سکتی ہے' نہ اس کی تربیت' نہ اسکے ساتھی'

نہ وہ کتابیں جن کو وہ پڑھتا ہے، نہ اس کے افعال، نہ اس کی سیرت نہ یہ سب بلکہ۔ اگر اس شخص کا خدا پر بھروسہ نہیں ہے، تو اس صورت میں اس کے تمام طریقے، گفتگو کا انداز، اس کے جملوں کا الٹ پھیر اس کی رایوں کی ساخت ہی ازخود اس حیثیت کو ظاہر کردے گی، خواہ وہ کیسے ہی اہتمام سے اُسے مخفی رکھنا چاہے۔ برخلاف اسکے اگر اس نے اپنا مرجع صحیح پالیا ہے تو ربانیت اس کی ذات میں جلوہ افروز ہوگی خواہ جہالت، بے تربیتی، زمانے کی ناسا عدت کے کتنے ہی پردے اس پر پڑے ہوئے ہوں۔ حق تو یہ ہے کہ جستجو میں ہونا ایک بات ہے اور کسی بات کو پائے ہوئے ہونا امر دیگر ہے۔

مقدس تعلیم یا علمی تعلیم دینے والوں میں باہم فرق ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایک جماعت دل سے یا تجربہ حاصل کرکے حالیہ تعلیم دیتی ہے یعنی وہ لوگ جن پر حقائق گذر چکے ہیں۔ اور دوسری جماعت بیرونی دل سے یعنی محض تماشائی کی حیثیت سے یا ان کے لئے یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ دوسرے لوگوں کی کہی سنی باتیں بیان کرتے ہیں۔

مثلاً شاعروں میں ہربرٹ اور پوپ میں بڑا فرق ہے۔ فلاسفروں میں اسپنسر، کینٹ، کو کیمرج اور لوک، پالی، میکنٹوش اور اسٹیوارٹ جیسے فلاسفروں میں بڑا فرق ہے۔ دنیا کے باکار آدمیوں میں سے بہت سے ایسے لوگ ہیں جو کامل طور سے گویا مانے گئے ہیں اور اِدھر اُدھر جوش سے بھری ہوئی پیشین گوئیاں کرتے پھرتے ہیں۔ ان میں اور ایسے اشخاص میں جو اپنے غیر محدود خیالات کی بناء پر نیم دیوانے سے ہو گئے ہیں، بڑا فرق ہے۔ سنی سنائی باتوں کی تلقین کرنا میرے لئے بیکار ہے۔ ایسا تو خود میں بھی آسانی سے کرسکتا ہوں۔ حضرت مسیح علیہ السلام جو بات کہتے ہیں وہ دل سے کہتے ہیں اور اس وجہ سے وہ بات ایک حد تک دوسرے لوگوں سے بڑھ جاتی ہے، حق تو یہ ہے کہ یہ ہی معجزہ ہے۔ پہلے سے میرا یہ ہی عقیدہ ہے کہ ایسا ہونا بھی چاہئے۔ ہر شخص ہمیشہ اس بات کی آرزو میں رہتا ہے کہ اسی قسم کی تعلیم دینے والا شخص مبعوث ہو۔ لیکن اگر کوئی شخص دل سے بات نہیں کرتا جیسا کہ اسے کرنا چاہئے تو اسے شرم کے ساتھ اس بات کا اعتراف کر لینا چاہئے۔

اسی قسم کا ربانی علم ذہن میں داخل ہو جاتا ہے اور غیر معمولی ذکاوت کا باعث ہوتا ہے۔ دنیا کی بیشتر دانشمندی' دانشمندی نہیں ہوتی اور حق تو یہ ہے کہ انسانوں کا نہایت روشن ضمیر طبقہ' ادبی اور علمی شہرت سے بے نیاز ہوتا ہے اور مصنفین و مؤلفین کے طبقہ میں نہیں ہوتا۔ عالموں اور مصنفوں کے گروہ میں ہمیں اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ ان میں کوئی مقدس ہستی بھی موجود ہے۔ ہمیں ان کی ہوشیاری اور ہنرمندی کا احساس ہوتا ہے مگر کسی خداداد علم کا یقین نہیں ہوتا۔ ان لوگوں میں ایک قسم کی سمجھ ہوتی ہے اور اس بات کو نہیں جانتے کہ وہ کہاں سے آتی ہے اور وہ اس سمجھ کو اپنی ذاتی فہم کہتے ہیں۔ دراصل انکی ہنرمندی کسی انسانی قوت کی افراط یا کوئی معمول سے زیادہ بڑھ جانے والا عنصر ہوتی ہے۔ اس لئے ان کی طاقتوری گویا ایک قسم کا مرض ہوتا ہے۔ ان مثالوں میں جو بیان کی گئی ہیں دماغ کی قوتیں کوئی نیکی نہیں ہوتیں بلکہ قریب قریب برائی معلوم ہوتی ہیں اور پھر ہم کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ایسے شخص کی

ہنر مندی خود اس کی حقیقت شناسی کے راستے میں حائل ہے۔ حالانکہ فراستِ صحیح خالص مذہبی چیز ہے۔ وہ نفس کا رفرما سے بہت زیادہ اخذ و جذب کرنے کا نام ہے۔ وہ الہام نہیں ہے بلکہ دوسرے آدمیوں کی فراست سے مشابہ ہے۔ تمام بڑے بڑے شاعروں میں ان کی انسانیت کی عقل و دانش ہے جو ان کی دیگر صفات سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ چنانچہ کسی مصنف کو لیجئے کسی شریف کو لیجئے، کوئی متعصب شخص ہو یا کوئی اچھا خاصا شریف آدمی۔ ان تمام لوگوں پر باوجود ان کی مخصوص صفت کے انسانیت کا اطلاق عائد نہیں ہوتا۔ بلکہ ہومر میں، چوسر میں، اسپنسر میں، شیکسپیر اور ملٹن میں انسانیت نمایاں طور پر پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ صداقت پر قانع ہیں۔ وہ محض سادہ الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ جو لوگ معمولی مگر سحر و لعزیز مصنفوں کی مبالغہ آمیز پر جوش رنگین عبارتوں کے پڑھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کو ان مذکورہ بالا شعرا کا کلام بالکل پھیکا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ وہ شاعر ہیں جنھوں نے روحِ علیم کو آزادی سے اپنی راہ نکالنے دی ہے جو اپنی پیدا وار

کو انکی آنکھوں سے پھر دیکھتی اور برکت دیتی ہے۔ یہ روح اپنے علم سے افضل اور اپنی تمام مصنوعات سے عاقل تر ہے۔ بڑا شاعر ہم کو ہماری مخفی خوبیاں محسوس کراتا ہے اور پھر اس صورت میں ہم کو اس کی تحریر کا زیادہ خیال نہیں ہوتا۔ ہمارے نفس کے لئے اس کا بہترین پیام یہ ہوتا ہے کہ جو خود اس نے لکھا ہے وہ پڑھنے والے کی نظر میں سبک اور ادنیٰ معلوم ہو۔ شیکسپیر ہم کو دانشمندی کی ایسی اعلیٰ وارفع باتیں سمجھاتا ہے کہ ہماری نظر ایسے خزانہ لازوال تک پہنچ جاتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں خود شیکسپیر کے عطیات ہیچ ہیچ سمجھنے لگتے ہیں اور پھر ہم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس کے تمام شاندار مصنفات جنھیں ہم دوسرے اوقات میں طبعی شعر کی قسم سمجھکر تحسین وآفریں کرتے ہیں دراصل وہ طبعی شعر فطرت صحیح پر اس سے زیادہ ثبات نہیں رکھتے جتنا کسی چلتے ہوئے مسافر کا سایہ کسی پہاڑ پر ثبات رکھتا ہے وہ القا جس سے ہملٹ اور لیر کی شکل میں ظہور کیا آئندہ بھی ہر وقت اسی قسم کے اعلیٰ خیالات کو ملفوظ کر سکتا ہے تو پھر اس صورت میں میں ہملٹ اور لیر کی کیا خصوصیت سمجھوں جس کے معنے یہ ہونگے

کہ گو ذہم ہیں وہ نفسِ ناطقہ نہیں ہے جس سے یہ اسطرح بر آمد ہوتے ہیں جیسے زبان سے اصوات۔

یہ قوت کسی فرد میں بجز اس طور کے اور کسی طور پر نزول نہیں کرتی کہ اس پر کلیتہً حاوی ہو جائے۔ یہ قوت منکسر المزاج اور سادہ لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ یہ ان لوگوں کے حصے میں آتی ہے جو غرور اور لایعنی خیالات سے متنفر رہتے ہیں۔ یہ قوت ایسے لوگوں کو بصیرت کی شکل میں عطا ہوتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ یہ قوت انہیں لوگوں کو متانت اور عظمت کی شکل میں ملتی ہے۔ جن لوگوں میں یہ قوت پائی جاتی ہے ہم ان کو دیکھ کر عظمت اور بزرگی کے بڑے بڑے درجوں سے واقف ہو جاتے ہیں۔ جب انسان کو یہ درجہ نصیب ہو جاتا ہے تو اس وقت سے اس کی حالت ہی بدل جاتی ہے۔ پھر وہ دوسرے لوگوں سے بات چیت کرتے وقت ان میں قبولیت پانے کا طالب نہیں ہوتا۔ بلکہ ایسا کرتے وقت وہ ان کو جانچا کرتا ہے مگر اس قوت کے لئے سادگی اور صداقت کی ضرورت ہے۔ حقیقی خود سے ساشرا اپنی زندگی کو ان واقعات سے ترتیب و زینت دیا کرتے ہیں

کہ فلاں بڑے شخص اور فلاں شاہزادے سے انکی ملاقات ہوئی تھی، اور انھوں نے اس کے ساتھ فلاں گفتگو کی تھی اور فلاں طرز عمل اختیار کیا تھا۔ ناشائستہ شہرت پسند لوگ فخریہ طور پہ لوگوں کو اپنے ظروف، سازوسامان اور زیورات دکھایا کرتے ہیں اور بڑے بڑے لوگوں کے خطوط اور تعریفوں کو اپنی بڑائی ثابت کرنے کے لئے محفوظ کر لیا کرتے ہیں۔ زیادہ شائستہ لوگ اپنی سمجھ کے مطابق بڑے بڑے واقعات جو ان پر گذر چکے ہوں لوگوں میں بیان کرنے کے لئے منتخب کر لیا کرتے ہیں۔ مثلاً روم کے سفر کے واقعات، اس سفر میں بڑے بڑے عالموں سے ملاقات کا ذکر، اچھے اچھے دوستوں کا ذکر جن کو وہ جانتے ہوں، اور اس سے بھی زیادہ اس سفر میں بڑے بڑے میدانوں کا ذکر کرتے ہیں جو انھوں نے دیکھے ہوں۔ ان اعلیٰ خیالات کا بھی ذکر کرتے ہیں جن کا وہ کل مزا لے رہے تھے۔ غرض اس طریقے سے اپنی زندگی کو افسانہ نما بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن وہ روح جو اللہ عزوجل کی پرستش کے لئے بڑھتی ہے بالکل سادہ اور صداقت مآب ہوتی ہے۔ اس میں نہ کسی قسم

کی رنگینی ہے نہ اس کے ساتھ اچھے دوست ہوتے ہیں نہ اس میں کوئی شجاعت نہ کوئی دلیری کے کارنامے اور نہ اس کو ستایش کی تمنا ہوتی ہے اور وہ روزانہ معمولی دن کی ایسی ساعت میں سکونت رکھتی ہے جو اس وقت موجود ہے کیونکہ یہ ہی موجودہ وقت اور نہایت معمولی سے معمولی شئے اس کی فکرِ اعلیٰ سے حقیقت نما اور ایک نور کے سمندر کی موج بنجاتی ہے۔

کسی پاک باطن شخص سے گفتگو کیجیئے، اس کی باتوں کے مقابلے میں ساری شعر و شاعری اور انشاء پردازی محض لفظی جوڑ توڑ نظر آئینگے اس کے سب سے زیادہ سادہ سے سادہ الفاظ سب سے پہلے لکھنے کے قابل ہونگے مگر پھر بھی وہ اتنے ارزاں اور معمولی ہونگے کہ اس دولت لازوال کے خزانہ کی جس کی روح مالک ہے ایسی حیثیت ہے جیسے زمین کے اوپر سے چند پتھر چن لئے جائیں یا تھوڑی سی ہوا کو ایک شیشی میں بند کر دیا جائے جبکہ تمام کائنات ہی ہماری ہے۔ اگر تم اس تصنع کو چھوڑ دو اور انسانوں کے ساتھ محض صداقت، صاف دلی اور اصلی حال کے اظہار کرنے میں کوئی اینچ پینچ نہ کرو تو تم بھی اس

زُمرے میں داخل ہوجاؤ گے۔

اس قسم کے پاک باطن لوگ جن کا اوپر ذکر ہوا تمھارے ساتھ ایسا برتاؤ کرینگے جیسا کہ ملائکہ کرتے۔ وہ زمین پر ملائکہ کی طرح رہینگے اور بغیر کسی قسم کی تعریف کے تمھاری حسنِ طبع تمھاری سخاوت حتیٰ کہ تمھاری نیکی کو دیکھکر ان باتوں کی کوئی خاص داد نہ دینگے کیونکہ نیکی تو گویا تمھارا ایک فرض منصبی ہے اور یہ خوبیاں جو تم میں ہیں انھیں کے سرشت کے مطابق ویسی ہی شاہانہ اور ویسی ہی ملائکہ پرور ہیں۔ لیکن ان کی سادہ ہمدردانہ صورت اس جھوٹی کو کیسا ذلیل کردیتی ہے۔ جو مصنفین ایکدوسرے کی کرتے ہیں وہ گویا خود اپنے آپ کو نقصان پہنچاتے رہتے ہیں۔ یہ پاک باطن لوگ بیجا ستایش نہیں کرتے۔ میرے نزدیک یہ لوگ کروم ویل کرسٹینا، چارلس دوم، جیمس اول اور سلطان روم سے ضرور ملنے کے لایق ہیں۔ اس وجہ سے کہ وہ اپنے خیالات کی بلندی کے اعتبار سے بادشاہوں کے ساتھی ہوتے ہیں اور اہل دنیا کی گفتگو کے نملا ماند لب ولہجہ سے انھیں ضرور ناگوار ہی ہوتی ہوگی۔ ان لوگوں کی نسبت ایسا سمجھنا چاہیے کہ گویا

ان کو بادشاہوں کی ہدایت کے لئے خدا نے بھیجا ہے اس وجہ سے کہ جب وہ بادشاہوں کے سامنے آتے ہیں تو بالکل بیباکانہ آتے ہیں جیسے ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کے پاس بلا تکلف آیا کرتا ہے اور یہ لوگ بادشاہوں کی فطرت عالی کو ضبط سے اور انسانی سادگی کے احساس سے بلکہ سب سے برادرانہ تعلقات قائم رکھنے کی لذت سے آشنا کرتے ہیں اور انھیں نئے نئے خیالات سمجھاتے ہیں۔ اور پھر ان کی ملاقات ان بادشاہوں کو زیادہ دانشمند اور زیادہ بلند رتبہ انسان بنا دیتی ہے۔ پاک باطن نفوس ہمکو محسوس کراتے ہیں کہ خلوص خوشامد سے کہیں زیادہ اچھی چیز ہے۔ مردوں اور عورتوں کے ساتھ ایسے سادہ تعلقات رکھو جس کی وجہ سے لوگ اس بات کو ضرور تصور کریں کہ تمھارے ساتھ خلوص برتا جائے۔ اور یہ کہ تمھیں بنانے کی کسی کو کوئی امید نہ رہے۔ یہ طریقہ (خلوص) بہترین ستایش ہے جو تم لوگوں کی کر سکتے ہیں۔ ملٹن کا قول ہے کہ اگر یہ لوگ کسی کی بڑی سے بڑی تعریف بھی کریں تو وہ "خوشامد نہیں ہے" اور ان لوگونکی سادہ سے سادہ نصیحت ایک قسم کی تعریف میں داخل ہے۔

روح کے ہر فعل میں انسان اور خدا کا اتحاد ایک ایسی چیز ہے جو ناقابل تشریح ہے۔ سادہ سے سادہ آدمی جو صفائے قلب سے اللہ عزوجل کی عبادت کرتا ہے، خدا میں جذب ہو جاتا ہے اور پھر اس بہتر اور جامع ہستی کی آمد اس شخص پر ہمیشہ نئی نئی شکلوں اور نامحدود صورتوں میں ہوتی رہتی ہے۔ اس آمد سے اس پر خوف اور تحیر طاری ہو جاتا ہے۔ اللہ عزوجل کا خیال انسان کے لئے کیسا اچھا اور کیسا تسلی بخش ہوتا ہے اور اس کی خلوت کو رونق بخشنے والا ہوتا ہے اور ہماری غلطیوں اور ناامیدیوں کے زخموں کو کیسا مندمل کر دیتا ہے۔ جب ہم دنیاوی لغویات کو چھوڑ دیتے ہیں اور لایعنی تحریر و تقریر سے بچتے ہیں تو اس صورت میں اللہ عزوجل اپنی حضوری سے دل کو منور کرتا ہے۔ اللہ عزوجل کی محبت دل کی قوتوں کا دگنا ہونے کا نام ہے، نہیں بلکہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس کی قوتیں نامحدود ہو جاتی ہیں اور دل میں یہ قوت بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ ہر پہلو سے عالم بے نہایت میں پہنچ جاتا ہے۔ جب انسان اس حالت پر آجاتا ہے تو اس کا ایمان نہایت پختہ ہو جاتا ہے۔ پھر

اس صورت میں تمام باتوں پر اس کو صرف اذعان ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کو نظر آنے لگتا ہے اور اس کو یہ بھی نظر آنے لگتا ہے کہ بہترین شئے وہ ہی ہے جو حق ہے۔ اس بنا پر اس کے تمام خاص خاص شبہات اور خوف آسانی سے دور ہو جاتے ہیں اور اپنے تمام خانگی واقعات کو وہ زمانہ کے انقلاب واقعی پر محمول کرتا رہتا ہے۔ اس کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اس کی عافیت اللہ عزوجل کو عزیز ہے۔ یہ قانون اس کے دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے اور اللہ عزوجل کی امداد کی اس پر ایسی فراوانی ہو جاتی ہے کہ اسکی رو میں اس کی تمام امیدیں اور ذاتی حالت کے مستقل منصوبے بہ جاتے ہیں۔ جو خوبیاں اس کے لئے مقدر ہیں وہ ان سے گریز نہیں کرسکتا۔ حق تو یہ ہے کہ جو باتیں تمہارے ساتھ مخصوص ہو چکی ہیں وہ پھر پھر کے تمہارے پاس آجائیں گی۔ تم اپنے دوست کی تلاش میں سرگرداں ہو۔ اپنے پیروں کو اس کی تکلیف برداشت کرنے دو۔ اپنے دماغ کو اس پریشانی میں مبتلا کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ اگر تم اس کو نہ پاؤ تو اس صورت میں کیا تم اس بات کو

تسلیم نہیں کروگے کہ یہ ہی بات بہتر تھی کہ وہ تم سے نہ ملے؟ اس وجہ سے کہ جو قوت تم میں ملنے کی موجود ہے وہ ہی قوت اُس میں بھی موجود ہے۔ اگر تمھاری ملاقات سے کوئی مفید نتیجہ نکلنے والا تھا تو تم دونوں ضرور ملتے۔ تم شوق و ذوق سے اس بات کی تیاری کررہے ہو کہ تم جاکر ایک ایسا کام انجام دو جس کے لئے تمھاری ذہانت اور تمھارا مذاق ترغیب دلاتا ہے یعنی انسانوں سے محبت کرو اور شہرت کی امید رکھو۔ کیا تمھیں اس بات کا خیال نہیں آیا ہے کہ تمھیں اس کے پاس جانے کا کوئی حق نہیں ہے تاوقتیکہ تم جانے سے محروم رہنے پر بھی اسی خوشی سے آمادہ نہو جیسے کہ جانے پر؟ اے شخص یقین کرکہ جب تک تو زندہ ہے اور دنیا میں جو باتیں سننے کے لئے تیری قسمت میں لکھی جاچکی ہیں اور جنکو تجھے ضرور سننا چاہیئے وہ باتیں تیرے کان کے پردوں میں گونجیں گی۔ ہر مثل، ہر کتاب، ہر لفظ، ان میں سے جو باتیں تمھاری مدد یا آسایش سے تعلق رکھتی ہیں وہ کسی نہ کسی طرح یقینی طور پر تمھارے پاس پہونچ جائیں گی۔ ہر دوست کو تیری وہی طبیعت نہیں بلکہ تیرے نازک

دل کا بہترین جذبہ ہم آغوش کرے گا۔ اور یہ اس وجہ سے ہوگا کہ
جو دل تیرے پاس ہے وہ نفس کلی ہے اور جس کے لئے نہ کوئی پردہ
ہے نہ کوئی دیوار حائل ہے۔ نہ فطرت میں کسی جگہ بھی کوئی حقیقی دوئی
ہے بلکہ ایک ہی خون تمام انسانوں کی رگوں میں بلا کسی رکاوٹ کے
اس طرح گردش کر رہا ہے جس طرح تمام دنیا میں ایک ہی سمندر ہے
اور اگر نگاہ حقیقت بیں سے دیکھا جائے تو وہ ایک ہی موج ہے۔

انسان کو چاہیئے کہ تمام فطرتی چیزوں کا اور تمام خیالات کا جو
انکشاف اس کے دل میں ہوا کرتا ہے علم حاصل کرے یعنی یہ کہ
اللہ عزوجل ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے اور یہ کہ اگر اسکو احساس
فرض شناسی ہے تو فطرت کے انکشاف کے تمام ذرایع اسی کے
دل میں موجود رہتے ہیں۔ لیکن اگر وہ چاہتا ہے کہ اللہ عزوجل کا کلام
سنے تو پھر اس صورت میں اس کو حضرت مسیح کے قول کے مطابق
"تارک الدنیا ہو جانا چاہیئے۔ اللہ عزوجل کا ظہور بزدلوں کے سامنے
نہیں ہوتا۔ دوسرے آدمیوں کے اقوال سے علیحدہ رہنا چاہیئے اور
اپنے ضمیر کی صدا کو غور سے سننا چاہیئے۔ جبتک اپنی دعاؤں میں

اثر نہ پیدا ہو دوسروں کی دعائیں اس کے لئے نقصان دہ ہوتی ہیں۔ ہمارے مذہب کی قدر و قیمت کو بے شعور لوگ اس کے پیروں کی تعداد پر منحصر کرتے ہیں۔ جب کبھی تعداد کا حوالہ دیا جاتا ہے خواہ وہ کتنے ہی پھیر سے کیوں نہ دیا جائے تو یہ گویا اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ نفس مذہب غائب ہو گیا ہے۔ وہ شخص جو اللہ عزّ و جلّ کے خیال کو بہترین اور اپنے اوپر محیط سمجھتا ہے اس کو اپنے ساتھ والوں کا کبھی خیال نہیں ہوتا۔ جب میں اسکی حضوری میں بیٹھتا ہوں تو اس وقت میرے پاس آنے کی کس کو جسارت ہو سکتی ہے؟۔ جب میں کمالِ انکساری سے اس پر تکیہ کرتا ہوں یا جب میں عشق حقیقی کی آگ سے فروزاں ہوتا ہوں تو اس موقع پر کالون اور سویڈن برگ کی کیا ضرورت رہتی ہے۔

یہ حالت کوئی تعرض اور امتیاز نہیں کرتی کہ ہم کثرت تعداد کی طرف رجوع کرتے ہیں یا شخصِ واحد کی طرف۔ وہ ایمان جو کسی سند پر مبنی ہوتا ہے وہ ایمان نہیں ہے۔ وہ مذہب جس میں کسی سند پر اعتماد کیا جاتا ہے اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ انور رقائقہ

میں کمی واقع ہونے لگتی ہے۔ یہ ایک مقام استناد ہے اس مقام کے حضرت مسیح کو دینے سے لوگ خود اپنی حقیقت (یا بے حقیقتی) ظاہر کرتے ہیں۔ مگر اس طرح کسی شخص کو مستند بنا دینے سے ازلی حقایق نہیں بدل سکتے۔ حقیقت میں روح باعظمت ہے اور اپنی فطرت سادہ پر عالی عالیہ ہے۔ جو نہ خوشامد کرتی ہے نہ کسی کی تبع ہے نہ وہ اپنے مقابلہ میں کسی سے رجوع کرتی ہے بلکہ اس کا اعتقاد اپنی ہی ذات پر ہوتا ہے۔ انسان کی زبردست ممکن قوتوں کے مقابلے میں اس کے تمام محض تجربے تمام گذشتہ سوانح خواہ وہ کتنے ہی پاک صاف اور قابل عزت کیوں نہ ہوں کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ اسی طرح اس بہشت کے مقابلے میں جس تک تمہیں ہمارے ادراک نے پہنچا دیا ہے ہم کسی دنیاوی زندگی کی جسے ہم نے دیکھا ہو یا یہ کہ کتابوں میں پڑھا ہو آسانی سے تعریف نہیں کر سکتے۔ ہم نہ صرف اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم میں بڑے آدمی نہیں رہیں بلکہ اگر سچ پوچھا جائے تو ہم صاف کہہ سکتے ہیں کہ ہم میں بڑا آدمی کوئی بھی نہیں ہے۔ اور یہ کہ کوئی تاریخ ہے یا سیرت

انسانی یا طرزِ زندگی جو تحریر میں آتی رہو اور ہماری پوری طور پر تشفی
کرتی ہو۔ ولی اور دیوتا لوگ جن کی تاریخ پرستش کرتی ہے اس
تعریف کو ذرا تامل کے ساتھ قبول کرنا چاہئے۔ گو عالم تنہائی میں اُنکی
یاد سے ہم میں ایک نئی قوت پیدا ہو جایا کرتی ہے تاہم جب وہ
ہماری توجہ پر اور زور ڈالتے ہیں جیسا کہ عموماً ہوا کرتا ہے تو ہمارے
دماغ کو تکان اور زحمت محسوس ہوتی ہے۔ روح خلوص کے ساتھ
اپنے آپ کو اس وحدہٗ لاشریک کی ذات کے حوالے کر دیتی ہے
جو سب کا مبدأ ہے اور پاک ہے۔ اگر روح نے اپنے آپکو اس
ذات بزرگ و بالاتر کے حوالے خلوص سے کیا ہے تو وہ ذات
اس روح میں نزول فرماتی ہے رہنمائی کرتی ہے اور اسی کے
ذریعہ بولتی ہے۔ پھر وہ (روح) خوش و خرم قوی اور لطیف ہو جاتی
ہے۔ اس میں اس وقت دانائی نہیں ہوتی بلکہ تمام باتیں اس پر
عیاں ہو جاتی ہیں۔ وہ پھر مذہبی نہیں رہتی بلکہ بالکل معصوم ہو جاتی
ہے۔ جب وہ اپنی ذات کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو پھر اس کو
محسوس ہوتا ہے کہ گھاس کا اُگنا اور پتھر کا گرنا ایسے قانون سے

متعلق ہے جو اس سے کمتر اور اس کی ماہیت کے تحت ہو۔ روح کہتی ہے' دیکھو! میرا مبداء در حقیقت وہ نفس کا رفرما ہے جو سب سے بزرگ و برتر ہے۔ میں ناقص ہوں مگر اللہ عزوجل کی پرستش کرتی ہوں جو جامع کمالات ہے۔ میں کبھی نہ کسی طرح نفس کارفرما سے ہدایت قبول کرتا رہتا ہوں اور میں سورج اور ستاروں کی طرف توجہ نہیں کرتا اس وجہ سے کہ اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ چیزیں اپنے خاصے حوادث ہیں' یعنی جن میں تبدیلیاں ہوا کرتی ہیں۔ ربانی خیالات کی موجیں جتنی میرے اندر موجزن ہوتی ہیں' میں اپنے افعال و کردار میں گویا دنیا کی بھلائی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں۔ یہانتک کہ میری زندگی پھر خیالات میں بسر ہونے لگتی ہے اور پھر میں ایسی قوتوں سے کام لیا کرتا ہوں جو غیر فانی ہیں۔ چنانچہ روح کی اور علم کی عزت کرنے سے جیسا کہ گذشتہ زمانے کے لوگ کہہ گئے ہیں کہ "روح بہت خوبصورت ہے" انسان کو یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ دنیا روح کے کاموں کا ایک دوامی معجزہ ہے اور پھر اسکو خاص خاص خوارق پر زیادہ حیرت نہ ہوگی۔ پھر رفتہ رفتہ اس کو

یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ کہ کوئی محدود تاریخ نہیں ہے۔ کہ تمام تواریخ متبرک ہیں۔ کہ عالم ایک ذرہ میں نمودار ہے یا یہ کہ ایک لمحۂ وقت میں۔ جب انسان پر یہ صداقت عیاں ہو جائیگی تو پھر وہ اپنی روح کو بھٹکنے نہیں دیگا بلکہ وہ خدائی وحدت کے ساتھ زندگی بسر کریگا۔ اپنی زندگی میں برائیوں سے محترز رہیگا۔ ہر جگہ خوش و خرم رہیگا اور ہر کام کو جس کو وہ کر سکتا ہے خوشی سے انجام دے گا۔ وہ اس اعتماد پر بھولے کہ خدا اس کے ساتھ ہے کل کے آنے والے واقعات کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار رہے گا اور اس طرح حقیقت میں تمام مستقبل اسکے قلب پر روشن ہو جاتا ہے۔ فقط



بلبل



یہ مضمون کیٹس کی مشہور آفاق نظم "اوڈ ٹو نائٹنگیل" کا ترجمہ تو نہیں ہے مگر پلاٹ اسی کا ہے۔ کہیں کہیں اُس کے خیالات بھی آگئے ہیں۔ انگریزی لٹریچر میں اس نظم کی شرکت اس کی خوش قسمتی سمجھی جاتی ہے۔ اردو داں حضرات اسکو اردو دیکھکر اگر اردو کی بدقسمتی ہی تصور فرمائیں تو بھی میں سمجھونگا کہ میری محنت ٹھکانے لگ گئی۔ مؤلف

میرے دل میں درد اُٹھ رہا ہے، حلق میں کانٹے پڑے جا رہے ہیں تشنگی حد سے تجاوز کرتی جا رہی ہے۔ اے فضائے آسمان کے مکینو! چاند اور ستارو! اور اے مشام جان کو معطر کرنے والی ہواؤ! تم سب اس حالت کے گواہ رہنا۔ کاش مجھے اس وقت شراب عشق کا ایک گھونٹ صرف ایک ہی گھونٹ ملجائے جس سے میں اپنے حلق

کوشش کر سکوں اور گلوں کے فراق میں زار و نالی کرنے والے پرندے کے ساتھ ہمنوا ہو سکوں۔ اے بلبل تیری صدائے دردناک نے میرے دل و دماغ پر ایسا اثر کیا ہے جس کو میرے حرکات و سکنات میرا دل حتیٰ کہ میری زبان بھی بیان نہیں کر سکتی۔ بعض اوقات مجھے تیری خوش قسمتی اور آزادی پر رشک آتا ہے اس لئے کہ تو نے تمام علائق دنیوی کو گلوں کی ہوا داری پر قربان کر دیا ہے۔ کاش ایسی آزادی مجھے بھی نصیب ہو جائے جس سے میں دنیا کے بکھیڑوں سے الگ تھلگ رہ کر اپنے باقی ماندہ نفوس کو قدرت کی کرشمہ سازیوں پر نثار کر سکوں۔

مجھے شراب چاہیئے اور ایسی شراب مل بھی سکتی ہے جس کو پی کر میں تھوڑی دیر کے لئے دنیا و مافیہا کے بکھیڑوں سے آزاد ہو جاؤں ہو جاؤنگا۔ مگر آہ! اُس کا نشہ عارضی ہوگا اور اُس کا سرور اترتے ہی میں دوگونہ مصائب میں مبتلا ہو جاؤنگا۔ اے دردمند دل رکھنے والے بلبل میرا دل بھی تیرے دل کی طرح بیٹھا رہتا ہے۔ مجھے ایسی شراب کی ضرورت ہے جو صرف ایک ہی گھونٹ میں مجھے بے خبر

کر دے اور ایسی استغنا اور بے پروائی کی شان پیدا کر دے کہ عزیز سے عزیز دوست بھی مجھے متوجہ نہ کر سکے اور پھر ایسی حالت میں میں تیرے ساتھ سیر صحرا میں مصروف ہو سکوں۔

مجھ پر ایسی دیوانگی مسلط ہو اور ایسی محویت چھائی ہوئی ہو کہ غم کو خس و خاشاک سمجھوں اور خوشی کی میرے دل میں تار عنکبوت سے زیادہ وقعت نہ ہو۔ غرض احساسات دنیوی سے ایسا لاپروا اور غافل ہو جاؤں کہ دیوانوں کو مجھ پر رشک اور حیرت ہو۔ آفتاب اپنی ضیا بار کرنیں عابدوں پر، زاہدوں پر، رندوں پر، مے خانوں پر، عرب کے ریگستانوں پر، غرض دنیا کے چپہ چپہ پر یوں ہی ڈالتا رہیگا۔ چاند کی نقرئی کرنیں قبرستانوں پر، شبستان عیش پر یوں ہی پڑتی رہیں گی۔ ستارے آسمان پر یوں ہی روشن رہینگے اور بھولے بھٹکے مسافروں کی یوں ہی رہنمائی کرتے رہینگے۔ پہاڑ یوں ہی سر بسجود ہوا کرینگے اور زمین اسی طرح سبزہ زار ہوتی رہے گی۔ سمندر خشک ہوا کرینگے، زمین اسی طرح گہوارۂ سیلاب بنا کرے گی زمین اسی طرح گردش محوری میں رہے گی اور اسی گردش پیہم کیساتھ

ساعتوں کے اوراق بکھرتے رہیں گے۔ ظاہر پرست دنیا والے گردش زمانہ کو صرف زمانہ کے لیل و نہار پر محمول کرتے رہینگے، اور پہلو میں دل اور دل میں درد رکھنے والی ہستیاں قدرت کی کرشمہ سازیوں کو غور بین نگاہوں سے دیکھتی رہینگی اور کائنات کی اس رقص پیہم سے اثر پذیر ہوتی رہیں گی اور نتائج پر غور کرتی رہیں گی۔ مگر اے بلبل تو ان کی طرح فانی نہیں ہے۔ تو غیر فانی ہے ہمیشہ تڑپتا رہیگا اور درد مند دلوں کو بیتاب کرتا رہیگا۔ تیری صدائے بازگشت دنیا کو محو حیرت کرتی رہیگی۔ میں تجھ سے تیرے جذبات مستعار لیکر نہیں بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ خود ایسا جذبہ پیدا کروں جس سے میں تیرے ساتھ پرواز کرسکوں اور جس طرح تو قدرت کے مناظر سے متاثر ہوتا رہتا ہے اسی طرح میں بھی تیرا ہم پرواز ہو کر مستفیض ہوا کروں۔

میں سوچتا ہوں اور خیال کرتا ہوں تو خیالات کے بحر بیکراں میں غرق ہو کر گم ہو جاتا ہوں، دل و دماغ پریشان ہو جاتا ہے۔ مگر طبیعت کی استعداد میرے جذبات کو ابھار کر اس بات پر آمادہ

کرتی ہے کہ باوجود اس ضعف اور کمزوری کے میں تیرے ساتھ پرواز کرسکوں۔ مگر ناممکن۔ تو کیا میں قوتِ متخیلہ کے برق سیر جہاز کی مدد سے تیرے ساتھ پرواز کرکے تیرا ہم آہنگ ہوکر تیرا ساتھ دے سکونگا۔ مگر افسوس! تیری بلند پروازی اب بھی مجھے پیچھے چھوڑ دے گی۔

میں اس وقت ایسی جگہ بیٹھا ہوا ہوں جو دراصل خوش قسمتوں ہی کا حصہ ہے۔ یعنی میرے قریب ہی ایک چشمہ بہا کر آرہا ہے وہ صدائیں بلند ہو رہی ہیں جن سے میری روح خوشی کے غیر معمولی جذبے سے مسرور ہو رہی ہے۔ اشجار حالتِ وجد میں ہیں اور مجھ پر سایہ فگن چاند کی کرنیں جھومتی ہوئی شاخوں اور ہلتی ہوئی ٹہنیوں میں سے ہوکر پانی کی چھوٹی چھوٹی موجوں سے کھیل رہی ہیں۔ بیشمار حباب پانی میں اٹھتے ہیں اور ستاروں سے ہمسری کرکے غائب ہو جاتے ہیں۔ چاندنی کا عکس ہوا کے ساتھ چمکتا آتا ہے اور پھر گم ہو جاتا ہے۔ طرح طرح کے پھول چاروں طرف کھل رہے ہیں۔ میں انکو دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں

مگر دیکھ نہیں سکتا۔ ہاں کبھی کبھی دل و دماغ کو فرحت دینے والی خوشبو ہوا کے ساتھ آجاتی ہے اور ان تمام چیزوں کا سماں میری آنکھوں کے سامنے اس طرح پھر جاتا ہے جیسے کہ میں حقیقت میں انکو اصلی حالت میں دیکھ رہا ہوں۔

اس پر لطف منظر کے ساتھ تیری خوشگوار آواز نے میرے اوپر ایسی حالت طاری کر دی ہے جس کو میں بیان نہیں کر سکتا۔ اور تیری آواز نے میرے دل کے ساتھ ایک ایسا مقناطیسی کشش کا سلسلہ قایم کر لیا ہے کہ اس کے سننے میں ہمہ تن مصروف ہوں اور اس بیخودی کی حالت میں موت کو محبت کی نظروں سے دیکھ رہا ہوں۔ موت گو بظاہر تلخ ہوتی ہے اور اس کے خیال ہی سے لوگوں کو تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ مگر میں اس وقت متمنی ہوں کہ اے موت آ، اور جلد آ، اور اس وقت روح کو میرے جسم سے نکال لے۔ پھر ایسا بہتر موقع تجھے کہاں مل سکیگا۔ میں اس وقت ہر طرح تیرے استقبال کے لیے موجود ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آئندہ زندگی میں ایسا خوش نصیب وقت میسر نہ آسکے گا۔ ہمیں ایک نہ ایک

دن مرنا ہے اور ضرور مرنا ہے۔ اے بلبل تو قدرت کی کرشمہ سازی پر نوا سنجی کرتا رہے گا اور فضائے باد میں ہمیشہ روح پھونکتا رہے گا۔ میں اس محویت کے عالم میں چاہتا ہوں کہ میری روح جسمِ نزار سے پرواز کر جائے اور ہمیشہ کے لئے دارالامن میں پہنچ جائے۔ مگر آہ! پھر یہ دلکش منظر خواب و خیال ہو جائے گا اور پھر اے بلبل! یہ فانی کان تیری نوا سنجیوں سے کبھی آشنا نہ ہو سکینگے۔

اے غیر فانی پرندے تیرے اوپر دنیا کی نیرنگیوں کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ بیرحم زمانہ تجھ کو پامال نہیں کر سکتا۔ یہ وہ شیریں اور دلکش آواز ہے جس کو میں آج کی بے ثبات اور فانی رات میں سُن رہا ہوں اور تھا لیا یہ وہی آواز ہے جس کو سُنکر گزرے ہوئے لوگ ایسے محوِ حیرت ہوئے کہ حشر ہی کے دن بیدار ہونگے میں مشاہداتِ دنیوی سے ایسا بیزار ہو گیا ہوں کہ مجھ کو ایک لمحہ سکون نصیب نہیں ہوتا۔ کرب و بیچینی کی حالت میں بسترِ غم پر پڑا ہوا کروٹیں بدلا کرتا ہوں۔ اگر کوئی مونس و غمخوار ہے تو وہ ہی مصائب اور آلام۔ انھیں خیالاتِ غم کی فراوانی میں مولانا روم

کا وصل و فصل والا شعر گنگنانے لگا۔ وصل و فصل کے فلسفہ پر غور کرنے کے بعد فصل (جدائی) کے لفظ نے دل کے ساتھ تیر و نشتر کا کام کیا۔ خیال گزرا کہ اے بلبل آہ کیا تو اب مجھ سے جدا ہو جائیگا خدا کرے یہ میرا صرف خیال ہی خیال ہو۔ مگر جب دیکھا کہ بلبل کا وہ شیریں نغمہ بہت مدھم آواز میں آ رہا ہے تو معلوم ہو گیا کہ یہ خیال کا دھوکا نہیں ہے، بلکہ حقیقت میں بلبل مجھ کو داغِ جدائی دے کر جا رہا ہے۔ اے لو! وہ ایک درخت سے دوسرے درخت پر اور اس درخت سے وہ سامنے والی پہاڑی کے درخت پر چلا گیا اور پھر خدا جانے وہاں سے کہاں غائب ہو گیا۔ آہ اے بلبل جا۔ خدا حافظ۔ الوداع' الوداع۔

اس آخری لفظ کی تکرار سے میری آنکھ کھل گئی، اور میں یہ کہتا ہوا رہ گیا۔

"خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا"



